ماہنامہ ترجمان القرآن

نومبر + دسمبر ۹۱
معہ ۷۰

نومبر دسمبر ۹۱

جاری کردہ :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)



تفہیم القرآن کے بعد

تفہیم سیرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے

سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

***

جلد اوّل ـــــــــ بنیادی مباحث

جلد دوم ـــــــــ ولادت سے ہجرت تک

سائز: ۲۰×۲۶/۸ ○ کتابت: دلکش ○ طباعت: عکسی ○ جلد: نفیس

ضخامت جلد اوّل: ۷۶۴ صفحات ◉ ضخامت جلد دوم: ۷۶۴ صفحات

دونوں جلدیں نقشے اور تصاویر سے مزیّن ہیں

قیمت مکمل سیٹ: -/۲۰۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار ○ لاہور

جلد ۱۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ **ترجمان القرآن** لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء جمادی الاول جمادی الثانی ۱۴۱۲ھ عدد ۴

فہرست مضامین

رابطہ و ترسیل زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۱۲ روپے زرِ سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

اشارات

خُرم مراد

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱کو' اسپین کی سرزمین پر 'میڈرڈ کے مقام پر 'امریکہ کی نیو ورلڈ ڈپلو میسی بالآخر اس بات میں کامیاب ہوگئی کہ اس نے عرب مسلمان ممالک کو اسرائیل کی یہودی ریاست کے سامنے گھٹنے ٹیک کر معاہدۂ امن کی بات چیت شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور اسطرح امریکہ' (اور روس'جس کا الگ سے نام لینا اب اس لیے ضروری نہیں کہ وہ امریکہ کا تابع اور ضمیمہ بن کر اس کے ساتھ بریکٹ ہو کر رہ گیا ہے)' کی بلائی ہوئی نام نہاد "مشرقِ وسطیٰ امن کانفرنس" کا آغاز ہو گیا۔

آج سے ٹھیک ۵۰۰ سال پہلے '۲۵ نومبر ۱۴۹۱ کو 'اسی اسپین کی سرزمین پر 'میڈرڈ سے تقریباً ۲۰۰ میل جنوب میں 'غرناطہؔ کے مقام پر اسپین کی آخری عرب مسلمان ریاست کے حکمران ' ابو عبداللہ محمد نے 'ناکہ بندی 'فاقہ مستی احسان مندی' اور خوف وطمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسپین کی عیسائی ریاست کے حکمرانوں 'فرڈی نینڈ اور ازابیلا اور ان کی فوجوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے 'اور "حصولِ امن" کے نام پر ہتھیار ڈالنے کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس صلح نامہ کے تحت ابو عبداللہ نے یہ وعدہ کیا کہ ۶۰ روز کے اندر وہ غرناطہ کا شہر' الحمرا کا قلعہ' اور تمام سامان جنگ عیسائیوں کے حوالے کر دے گا۔

اس صلح نامہ کے لیے 'جو اسپین میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے پروانۂ موت تھا'ساری بات چیت ابوعبداللہ اور اس کے وزرا نے بالکل خفیہ اور عامتہ المسلمین کو بالکل بے خبر رکھ کر کی ۔ کیونکہ تمام مسلمان' مہینوں کی ناکہ بندی اور فاقہ کشی 'تعداد کی قلّت اور اسلحہ کے فُقدان کے باوجود' طارق بن زیاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی جانیں نثار کر کے جہاد کے لیے آمادہ

تھے۔ لیکن یہ وزرا و امرا کی مجلسِ مشاورت تھی‘جس میں شہر کے علما و شیوخ بھی موجود تھے‘ جس نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا کہ عیسائی ریاست سے صلح کرلی جائے‘ اس لیے کہ اگر ہم جنگ ہار گئے تو عیسائی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ایک طرف ابو عبد اللہ نے اپنے وزیر ابوالقاسم عبدالملک کو خفیہ طور پر فرڈی نینڈ کے پاس بھیجا‘ جو رات کو قلعہ سے باہر جاکر عیسائیوں سے ملاقات کرتا‘ اور صلح نامہ کی شرائط طے کیا کرتا تھا۔ دوسری طرف شہر کے اندر عیسائی امرا دوستی کے پردہ میں خواص و عوام میں رشوتوں کا جال بچھا کر ان کو کھوکھلا کر رہے تھے۔

اس صلح نامہ کے ساتھ ساتھ‘جس میں غرناطہ کے عام مسلمانوں کو مستقبل میں امن و تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی‘ ایک اور معاہدہ بھی ترتیب دیا گیا۔ اس میں ابو عبداللہ کے لیے خصوصی مراعات کی ضمانت دی گئی تھی۔ جب عام مسلمانوں اور فوج کو اس صلح نامہ کی تباہ کن اور ذلت آمیز شرائط کا علم ہوا تو وہ اس کے خلاف ہو گئے۔ابوعبداللہ نے گھبرا کر‘کہ کہیں عوام بغاوت پر نہ اتر آئیں اور بنا بنایا کام نہ بگاڑ دیں‘ساٹھ روز پورے ہونے سے پہلے ہی فرڈی نینڈ کو پیغام بھیج دیا کہ عیسائی قصرالحمرا اور غرناطہ پر فوراً قبضہ کرلیں۔

۲ جنوری ۱۴۹۲ کو‘ اِدھر عیسائی فوجیں غرناطہ میں داخل ہوئیں‘اُدھر اسپین میں آخری مسلمان حکمران ’ابو عبداللہ محمد‘ اور اس کے اہلِ خاندان اور ساتھی ’زرق برق ریشمی کپڑوں میں ملبوس اور ہیرے جواہرات سے لدے پھندے‘ قصرالحمرا سے برآمد ہوئے۔ فاتح غرناطہ کو داخل ہوتے دیکھ کر ابو عبداللہ گھوڑے سے نیچے اتر پڑا‘ اس کے گھوڑے کی باگیں تھام لیں‘شہر کی چابیاں بصد عجزو نیاز اس کے حوالے کیں‘ اور عرض کیا ”یہ کنجیاں اسپین میں عربوں کے اقتدار کی آخری نشانی ہیں۔ آپ انھیں لے لیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہمارا ملک‘ہمارے مال اور ہماری جانیں سب آپ کی ملکیت ہیں۔امید ہے کہ آپ نے جیسا وعدہ کیا ہے اسی کے مطابق معاملہ کریں گے“۔ فرڈی نینڈ نے ابوعبداللہ کو یقین دلایا کہ ”مسلمانوں سے جو وعدے کیے گئے ہیں انھیں پورا کیا جائے گا“ (احسان الحق‘مسلمان یورپ میں‘ص ۲۹۳)

الحمرا کے بلند ترین برج پر چاندی کی صلیب آویزاں کر دی گئی‘ اور اسپین سے اسلام اور مسلمانوں کا ۷۸۱ سالہ پرانا نام و نشان مٹانے کا عمل شروع ہو گیا۔ عہد نامۂ امن میں مسلمانوں کو ان کے جان و مال اور دین و ایمان کی سلامتی و تحفظ کی جو ضمانتیں دی گئی تھیں‘وہ اپنی جگہ کاغذ پر بڑی دل خوش کن تھیں۔ مثلاً کسی مسلمان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا‘مسلمانوں کو اپنے مذہب پر چلنے‘ اپنا لباس پہننے‘ اپنی زبان بولنے‘اپنی رسوم منانے‘اپنے

معاملات شریعت کے مطابق طے کرنے کی پوری آزادی ہو گی 'مساجد اور اوقاف برقرار رہیں گے' تین سال تک کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا اور اسکے بعد بھی کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ اتنے دل خوش کن وعدے 'حیرت ہوتی ہے' یہ کیسے یقین کر لیا گیا کہ ان کو پورا کیا جائے گا۔ مگر دشمنوں سے امیدوں اور ان پر اعتماد کے سوراخ سے مسلمان کتنی ہی دفعہ ڈسے گئے ہیں۔

عیسائی حکمرانوں کی یہ نیت بالکل نہ تھی کہ وہ کوئی بھی وعدہ پورا کریں گے' خواہ وہ ابوعبداللہ جیسے یار وفادار ہی سے کیوں نہ ہو۔ اس سے البشرات کے علاقہ کی حکومت کا وعدہ تھا' لیکن جلد ہی اس کو مراکش جلا وطن کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے یا نیست و نابود کرنے کے لیے ہر قسم کے ظلم و جور کا دروازہ کھول دیا گیا۔ جلد ہی ۱۴۹۹ میں ان تمام مسلمانوں کو جو عیسائیت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے' اسپین سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ ۱۵۰۲ میں ایسے تمام مسلمانوں کے قتل کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ اس طرح ان مسلمانوں کے علاوہ جو جان کے خوف سے عیسائی بن گئے تھے' باقی سارے مسلمان زندہ جلا دیئے گئے' یا قتل کر دیئے گئے' یا اسپین سے نکال دیئے گئے۔ بظاہر عیسائی بن جانے والوں کی مزید چھٹائی کے لئے ۱۵۲۶ میں شاہی فرمان کے ذریعہ عربی لباس پہننے' عربی زبان بولنا' اسلامی رسوم و رواج منانا' اسلامی نام رکھنا' یہاں تک کہ غسل کرنا بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ کتابیں جلائی گئیں' حمام مسمار کر دیئے گئے' مساجد کو گرجا بنا لیا گیا۔

۱۴۹۱ میں غرناطہ کے عہد نامۂ امن کے بعد چند سال کے عرصہ میں قسم کھانے کو ایک بھی خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے والا اس اسپین کی سرزمین میں باقی نہ رہا جہاں مسلمانوں نے ۷۸۱ سال حکومت کی تھی۔

> کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث کر دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین' اور ذرا سی مہلت ان کو نہ دی گئی۔ (الدخان ۲۵۔ ۲۹)

۱۹۹۱ میں "مشرق وسطیٰ امن" کے نام پر ہونے والی کانفرنس اسپین میں کیوں رکھی گئی؟ اس سوال کا قطعی جواب مشکل ہے۔ توجیہات بے شمار ہو سکتی ہیں' لیکن کیا یہ سوچنا بالکل

بعید از قیاس ہو گا کہ کانفرنس منعقد کرنے والوں کے ذہن و نفسیات میں اسپین کا انتخاب کرتے وقت اسپین میں اسلام اور عرب مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی ۵۰۰ سالہ برسی اور عرب مسلمان حکومتوں اور مغربی حکمرانوں کی پروردہ یہودی ریاست اسرائیل کے درمیان امن و صلح کی بات چیت کے آغاز کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رہا ہو گا۔ خصوصاً" مغرب کے اس کلچر سے تعلق رکھنے والوں کے ذہن میں' جہاں ہر فرد کی ہر سالگرہ بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ کیا عرب مسلمان شرکاء کو انجام سے متنبہ کرنا مقصود ہے؟ یا' ان پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا پیش نظر ہے؟ یا' یہ امن و صلح کی بات چیت انتقام کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے' جس کی ایک کڑی "سقوطِ غرناطہ" تھا؟ یا' یہ صرف اپنے تحت الشعور کی نفسیاتی تسکین کا سامان ہے؟

جواب جو کچھ بھی ہو' یہ سمجھنے کے لئے کہ میڈرڈ کانفرنس سے امریکہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے' ہمیں امریکہ ــــ اسرائیل ـــ فلسطین / عرب / مشرقِ وسطیٰ کے مثلّث کے تاریخی پس منظر کی نقاب کشائی کرنا ہو گی۔ پوری بات تو شاید اسی وقت کھل کر سامنے آئے گی جب مغرب ـــ اسلام تعلقات کی طویل تاریخ کی گرہیں کھولی جائیں' لیکن پھر بات بہت پھیل جائے گی۔

مغرب اور اسلام کے تعلق کی تاریخ ہو' یا امریکہ اور مغربی طاقتوں کی طرف سے اسرائیل کے قیام و بقا' اس کے تمام ناجائز عزائم و اقدامات کی مکمل اور غیر مشروط تائید' اور ہر مرحلہ پر اس کی بھرپور عسکری' مالی' اخلاقی' اور پروپیگنڈائی پشت پناہی کی تاریخ' جو اس سے واقف ہو اسے اس بات میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سوائے ایسے امن کے' اور اس حد تک امن کے' کہ جس سے اس کے اور مجموعی طور پر مغرب کے عزائم پورے ہوتے ہوں اور ان کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہو۔ نہ اس کے پیش نظر حق و انصاف کی بنیاد پر وہاں کے مسائل حل کرنا ہے۔ مغربی طاقتوں کے نزدیک' جن کی امامت دوسری جنگ عظیم کے وقت سے امریکہ کے پاس ہے' مشرقِ وسطیٰ میں انسان ـــ مرد' عورت اور بچے ـــ نہیں بستے' بلکہ وہاں اس تہذیب اور دین کے وارث اور ماننے والے بستے ہیں جس کے ماننے والے ایک ہزار سال تک مغرب کے لیے سب سے سنگین مسئلہ اور خطرہ بنے رہے۔ اور وہاں وہ تیل بستا ہے جو مغرب میں خوشحالی کے چراغ جلائے رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔

پہلی جنگ عظیم (۱۸ - ۱۹۱۴) میں جوں ہی مغرب کو اپنی فکر اور اپنے نظام کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا' اور اس کے مسلسل ترقی کے خواب بکھر گئے ' اس نے اپنی تاریخ کے سب سے سنگین مسئلے ' یعنی اسلام کے حل کی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں' تاکہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ ایک طرف عربوں اور ترکوں کو لڑا کر خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلّط جما کے' اس کو ایسی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں بانٹ کے جو کبھی اپنے دفاع کے قابل نہ ہو سکیں' وہاں اپنے تابعدار و باجگزار حکمران بٹھا کے ' قوم پرستی کا فسوں پھونک کے' ان کو ہمیشہ کے لئے باہم برسرِپیکار رہنے کا سامان کر کے ' اس بات کا انتظام کیا گیا کہ وہ کبھی بھی سر نہ اٹھا سکیں ' نہ کبھی مغرب کے تسلّط سے آزاد ہو سکیں۔ تیسری طرف' یہ اندازہ کر کے کہ بدلتے ہوئے حالات میں دور دراز ممالک پر براہ راست سیاسی و عسکری تسلط نہ ممکن ہو گا نہ اس کے اخراجات قابل برداشت' خود مشرقِ وسطیٰ ہی میں ' فلسطین میں اسرائیل کی ایک ایسی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو وہاں کی سب سے بڑی غالب عسکری اور اقتصادی طاقت ہو اور مغرب کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ گویا اب صلیبی سورما بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے' بلکہ یہودی ریاست ان کے حصے کا کام کرے۔

اتنے "اہم تہذیبی مقاصد" کی تکمیل کی راہ میں خود فلسطین میں بسنے والوں کا مقام اور اہمیت ان ریڈ انڈینوں سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی ' نہ ہے' جو امریکہ میں بستے ہیں۔ چنانچہ لارڈ بالفور نے ' جس نے ۱۹۱۷ میں فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے منصوبہ کا اعلان کیا تھا' ۱۹۱۹ میں ہی اپنے ایک میمورنڈم میں لکھا:

> ہم فلسطین میں وہاں کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے کی کسی ظاہری کوشش میں پڑنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے... چار بڑی طاقتوں (یعنی برطانیہ ' فرانس' روس اور امریکہ) کی وابستگی صیہونیت کے ساتھ بالکل مکمل ہے۔ اس لئے کہ صیہونیت ' حق ہو یا باطل اور اچھی ہو یا بری' یہ ماضی کی ایسی قدیم روایات پر قائم ہے' اور اس پر عصر حاضر کے ایسے تقاضوں ' اور مستقبل کی ایسی امیدوں کا انحصار ہے' جو اس بات سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم ہیں کہ اس قدیم سرزمین میں بسنے والے سات لاکھ عرب کیا چاہتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں۔

اگر مغربی طاقتوں کے نزدیک فلسطینیوں کو حال اور مستقبل کے عزائم کی خاطر بالکل

نظر انداز کیا جا سکتا ہے' تو یہودی تو فلسطینیوں کے وجود ہی سے انکاری ہیں۔ اسرائیلی وزیراعظم' گولڈا میئر کے الفاظ میں "ایسا نہیں ہوا کہ دہاں ایک فلسطینی قوم بستی تھی... ہم آئے اور ہم نے ان کو نکال کر باہر پھینک دیا ---- نہیں' ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا"۔

فلسطینیوں کے وجود کو اہمیت دینے یا ان کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ ایک فلسطینی ریاست کا قیام ہے' اسرائیل کی تباہی نہیں ۔ مگر فلسطینی ریاست نہ مغربی طاقتوں کے لئے قابل قبول ہے' نہ اسرائیل کے لئے ۔ اس لیے کہ یہ ان طویل المیعاد مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ہے جو اسرائیل مغرب کی خاطر' مغرب کی شہ پر' اور مغرب کی مکمل پشت پناہی سے' حاصل کرنے میں مسلسل لگا ہوا ہے۔ ان مقاصد کی واضح نشان دہی' اسرائیل کے قیام سے پہلے ہی' امریکن جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے ایک ٹاپ سیکرٹ (انتہائی خفیہ) پیپر (نمبر۱۱ / ۱۶۸۴ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸) میں کر دی گئی تھی۔ یہ مقاصد محض اسرائیل کے نہیں' بلکہ مغرب کے بھی ہیں :

۱۔ ابتدا میں فلسطین کے ایک حصے پر یہودی اقتدار۔

۲۔ پھر' فلسطین میں یہودیوں کا غیر محدود داخلہ (جو اب تک جاری ہے)

۳۔ پھر' پورے فلسطین پر یہودی اقتدار کی توسیع۔

۴۔ پھر' اردن' لبنان' شام' (بلکہ اس سے بھی آگے) "ارضِ اسرائیل" کی توسیع۔

۵۔ پھر' پورے مشرقِ وسطیٰ پر اسرائیل کا فوجی اور معاشی تسلّط ۔

امریکن جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے الفاظ میں "اس پروگرام کے سارے مرحلے یہودی لیڈروں کے نزدیک یکساں طور پر مقدّس ہیں"۔ (اور امریکہ و مغرب کے لئے یکساں طور پر اہم)

اسی لیے امریکہ اور اسرائیل پی ایل او کا وجود تسلیم کرنے یا اس سے کسی قسم کی بات چیت کرنے سے بالکل انکاری ہیں۔ ایک اسرائیلی کے الفاظ میں

یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک گروہ جس سے ہم ہرگز بات چیت نہیں کریں گے' وہ پی ایل او ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ یہ شرپسند لوگ ہیں' اصل رکاوٹ ان کے ایجنڈے کا موضوع ہے۔ یہ موضوع مغربی حصے میں فلسطینی ریاست کے قیام کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایسی چیز ہے جو ہم ہرگز نہیں مان سکتے (ڈیوڈ کریوائن' ہفت

روزہ اکنامسٹ لندن' ۱۰ جولائی ۱۹۸۳)

یہ سب تو فسانے ہیں' جو بڑی مہارت ' چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ گھڑے گئے ہیں' حقیقت کا روپ دیئے گئے ہیں' دنیا بھر میں پھیلائے گئے ہیں' گوبلز کے جھوٹ کی طرح دہرائے گئے ہیں' اور اہلِ مغرب کو باور کرائے گئے ہیں' کہ فلسطینی تو خود ہی فلسطین چھوڑ کر چلے گئے' عرب بشمول پی ایل او اسرائیل کا نام و نشان مٹانے کے درپے ہیں' مسلسل اس کے خلاف جنگ برپا کئے ہوئے ہیں' اسرائیل یکے بعد دیگرے اپنی بقا کی جنگیں لڑتا رہا ہے' اور پی ایل او ایک دہشت گرد گروہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بن گوریان' بیگن اور شامیر جیسے دہشت گردوں کی سرکردگی میں دہشت گردی' شہریوں کے خلاف جنگ' ان کا قتل عام اور تعذیب جیسے ہتھ کنڈوں کے ذریعہ فلسطینیوں کو گھروں سے نکال کر باہر پھینکا گیا ہے۔ عربوں کی طرف سے امن اور صلح کی ہر پیش کش کو اسرائیل نے اپنے وجود کے لئے جنگ سے زیادہ بڑا "خطرہ" سمجھا ہے۔ ہر جنگ کا سامان اسرائیل نے خود کیا ہے' اور اپنی "بقا" کے لئے نہیں' اپنی "توسیع" کے لئے لڑی ہے۔ اسرائیل کے ہر "جُرم" پر امریکہ نے اس کو مزید اسلحہ اور ڈالر فراہم کرکے ' اور اس کے خلاف قراردادوں کو ویٹو کرکے ' اس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔

اسرائیل کی دہشت گردی' اور امریکہ کی طرف سے اس دہشت گردی کی مکمل پشت پناہی کی داستان بیان کرنے کے لئے تو کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔ فلسطینی شہریوں کے خلاف جنگ اور دہشت گردی کا آغاز ۵ جنوری ۱۹۴۸ کو بیت المقدس کے عرب علاقے میں واقع سیمی رامیس ہوٹل کو ۱۷۵ پونڈ ڈائنا مائٹ سے اڑا کر کیا گیا۔ فلسطینیوں کو خوف زدہ کرنے کے علاوہ اس کارروائی کا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ ۹ اپریل ۱۹۴۸ کو ۱۴ مئی کے قیام اسرائیل کے اعلان سے بھی پیشتر' یہودی دہشت گرد تنظیموں ارگون (Irgun) اور اسٹرن (Stern) کے ۱۰۰ مسلح جوان بیت المقدس کے مضافات میں ایک چھوٹے سے عرب گاؤں ' دیریاسین پر حملہ آور ہو گئے' اور ۲۵۰ نہتے بچوں ' عورتوں اور مردوں کو ان کے گھروں سے ڈائنامائٹ سے اڑا دیا۔ ارگون کے کمانڈر نے اپنی کامیابی کے مژدہ کا تار ان الفاظ میں بھیجا "جس طرح دیر یاسین میں ' اسی طرح ہر جگہ ـــــ اے خدا ! اے خدا! ـــــ تو نے فتح ہمارے لئے مقدّر کر دی ہے"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مئی ۱۹۴۸ تک تین لاکھ فلسطینی اپنے گھروں سے نکل گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا'

اور لاکھوں فلسطینیوں کا مقدّر دربدر کی ٹھوکریں کھانا یا مہاجر کیمپوں میں پڑا رہنا بنتا گیا۔ پھر ۱۹۸۳ میں اسرائیل نے بیروت پر حملہ کر کے اور مہاجر کیمپوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے، فلسطینیوں کے "ارضِ اسرائیل" کی سرحدوں سے بہت دور نکل جانے کا سامان کر دیا۔

فلسطینیوں کو نکال دینے، پورے فلسطین پر قبضہ کر لینے، اور "ارضِ اسرائیل" قائم کرنے کے منصوبوں کو یہودی لیڈروں نے کبھی ڈھکا چھپا نہیں رکھا۔ یہ سب کارروائیاں اس لیے نہیں ہوئیں کہ عرب اسرائیل کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئے، یا اسرائیل سے برسرِ پیکار رہے، بلکہ اس لیے ہوئیں کہ اسرائیل پورے فلسطین پر بلاشرکت غیرے قبضہ، اور پورے مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے لئے معرکہ آرا ہے۔ تقسیم فلسطین کا منصوبہ قبول کرتے وقت بن گوریان نے واضح کر دیا تھا کہ "ہم اردن پر اپنے حق سے دست بردار نہیں ہو رہے ہیں... ہم پورے ملک میں رہیں گے۔ عربوں کی رضا مندی سے ہو، یا دوسرے ذرائع اختیار کر کے... (اگر عرب نہ مانیں) تو پھر ہمیں ان سے ایک دوسری ہی زبان میں بات کرنا پڑے گی۔ جب ہماری ریاست بن جائے گی، تب ہی یہ دوسری زبان ہمارے قبضہ میں ہو گی"۔ اور بیگن نے کہا کہ "وطن کی تقسیم غیر قانونی ہے، یہ کبھی تسلیم نہیں کی جائے گی... یروشلم ہمارا دارالسلطنت تھا، اور ہمیشہ رہے گا۔ ارضِ اسرائیل بنی اسرائیل کو واپس مل کر رہے گی۔ پوری کی پوری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے"۔ اسرائیلی ملٹری انٹیلیجنس کے ایک سابق سربراہ کے الفاظ میں "مستقبل میں کسی جنگ کی صورت میں ہمارے پاس سات آٹھ لاکھ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال دینے کا منصوبہ موجود ہے"۔

اس تاریخی پس منظر میں یہ دیکھنا بالکل مشکل نہیں کہ میڈرڈ کانفرنس سے کس کو کیا حاصل ہو گا، خصوصاً" اگر اس کانفرنس کے بعد کے مراحل اپنے مزعومہ نتائج تک پہنچ جاتے ہیں۔

جہاں تک اہلِ فلسطین کا تعلق ہے، روز نامہ گارجین کے ڈیوڈ ہرسٹ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ "اسرائیلی وزیراعظم شامیر نے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ سے جو شرائط منوا لی ہیں (یا باہم طے کر لی ہیں) وہ اس نوعیت کی ہیں کہ ان کا منطقی نتیجہ صرف ایک ایسا آخری تصفیہ ہی ہو سکتا ہے جس میں فلسطینیوں کا بحیثیت ایک قوم کے بالکل کوئی مقام نہ ہو، ایسی قوم جس کو ایک قوم کے معروف حقوق حاصل ہوں"۔ گویا میڈرڈ کانفرنس اگر ایک تصفیہ تک پہنچی تو وہ اہلِ فلسطین کا بھی آخری حل (فائنل سولوشن) ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ملے گا تو وہ

رسائل و مسائل

کیا جنت کی نعمتیں صرف مردوں کے لئے ہیں؟

سوال: ایک بات ایسی ہے جس کے متعلق بہت دنوں سے آپ سے پوچھنے کا سوچ رہی ہوں۔ کیوں کہ اگر میں کچھ زیادہ اس کے بارے میں غور کرتی ہوں تو میرا دل بار بار مجھے تنبیہہ کرتا ہے کہ دیکھ کہیں تو کفر کی سرحد میں تو داخل نہیں ہو رہی ہے؟ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ مسئلہ کن الفاظ میں آپ تک پہنچاؤں، کہیں میرے قلم کی کوئی لغزش مجھے کفر و الحاد کی کھائیوں میں نہ گرا دے۔ خدا سے دعا ہے کہ میری لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے!

جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر جگہ عورتوں اور مردوں کو یکساں احکامات دیئے گئے ہیں اور بعض جگہ ان کو ان کی معاشرتی حیثیت کے لحاظ سے الگ الگ بھی احکامات دیئے گئے ہیں۔ خوشخبریاں اور وعیدیں بھی دونوں کو اکثر جگہ ساتھ ساتھ ہی دی گئیں ہیں لیکن بعض سورتوں مثلاً سورۃ الرحمٰن اور سورۃ الواقعہ میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں مردوں کے لیے خوبصورت حوروں کا ذکر ہے، جو بے انتہا خوبصورت ہوں گی اور جن کو کسی انسان اور جن نے نہیں چھوا ہوگا۔ ان سورتوں میں جس طرح ان کا ذکر آتا ہے۔ اس کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے باقی تمام خوشخبریاں بھی صرف مردوں کے لیے ہی ہیں۔ عورت ہونے کی وجہ سے میرے دل میں سخت احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے۔ براہِ کرم مجھے اس سلسلہ میں مطمئن کریں۔

جواب: یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتی رہتی ہیں اور غور و فکر کرنے کی عادی ہیں۔ اللہ کرے آپ اس سلسلہ کو جاری رکھ سکیں اور علمِ نافع اور علمِ صالح کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرتی رہیں۔ آمین!

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ پاک نے سورۃ رحمان یا دیگر سورتوں میں اہلِ ایمان

کیلئے جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے' ان میں مومنین صالحین اور مومنات قانتات دونوں اپنے اپنے درجے اور مرتبے کے مطابق حصّہ دار ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے لحاظ سے ان کے مابین فرق نہیں رکھا گیا۔ سورۃ رحمان جسکی آخری آیات کے اسلوبِ بیان سے آپ کو شُبہ لاحق ہوا ہے' اگر آپ ان کا بغور مطالعہ فرماتیں' تو اشکال پیدا نہ ہوتا۔

ان آیات میں دو طرح کی حوروں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو اپنے ایمان اور عملِ صالح کی بنا پر جنت میں داخل ہوں گی۔ انہیں حسین و جمیل اور کنواری بنا دیا جائے گا اور دوسری وہ جو جنت میں اہلِ ایمان کے سرور و راحت کا سامان کرنے کے لئے پیدا کی جائیں گی۔ وہ ایمان اور عملِ صالح کی بدولت جنت کی مستحق نہ ہوں گی بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنّت میں داخل ہوں گی۔ پہلے درجہ کی حوریں اہلِ جنّت کی بیویاں ہوں گی اور ان کے ساتھ ان کے قصروں میں رہیں گی اور دوسرے درجہ کی حوریں اہلِ جنّت کی سیرگاہوں میں لگائے ہوئے خیموں میں ہوں گی۔ "فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ" (آیت نمبر ۷۰) "اس میں نیک سیرت حسین و جمیل حوریں ہوں گی۔" اس سے مومنات صالحات کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح "فِيهِنَّ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ" (آیت نمبر ۵۶) ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا" میں بھی ان ہی کی صفات کا بیان ہے۔

اس طرح سے مومنات صالحات کے لئے ضمناً" پردہ اور ستر کے اسلوب میں ان نعمتوں کا ذکر آگیا' جن کا مومنین صالحین کے لئے تذکرہ کیا گیا ہے۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں "اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خواہ کوئی عورت کنواری مر گئی ہو یا کسی کی بیوی رہ چکی ہو' جوان مری ہو یا بوڑھی ہو کر دنیا سے رُخصت ہوئی ہو؟ آخرت میں جب یہ سب نیک خواتین جنّت میں داخل ہوں گی تو جوان اور کنواری بنا دی جائیں گی اور وہاں ان میں سے جس خاتون کو بھی کسی نیک مرد کی رفیقۂ حیات بنایا جائے گا وہ جنت میں اپنے اس شوہر سے پہلے کسی کے تصرّف میں نہ آئی ہوگی (حاشیہ ۴۶ سورۃ رحمان تفہیم القرآن جلد پنجم) "حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ"۔ "خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں ہوں گی" (آیت نمبر ۷۲) کی تشریح میں فرماتے ہیں "خیموں سے مراد غالباً اس طرح کے خیمے ہیں جیسے امراء اور رؤساء کے لئے سیرگاہوں میں لگائے جاتے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ اہلِ جنّت کی بیویاں ان کے ساتھ ان کے قصروں میں رہیں گی۔ اور ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے ہوں گے' جن میں حوریں ان کے لیے لطف و لذت کا سامان

فراہم کریں گی۔ ہمارے اس قیاس کی بنا یہ ہے کہ پہلے خُوب سیرت اور خُوبصورت بیویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد ان حوروں کا ذکر الگ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ان بیویوں سے مختلف قسم کی خواتین ہوں گی۔ اس قیاس کو مزید تقویت اس حدیث سے حاصل ہوتی ہے جو حضرت اُم سلیمؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا دنیا کی عورتیں بہتر ہیں یا حوریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "دنیا کی عورتوں کو حوروں پر وہی فضیلت حاصل ہے جو ابرے کو استر پر ہوتی ہے"۔ میں نے پوچھا کس بنا پر؟ آپؐ نے فرمایا "اس لیے کہ ان عورتوں نے نمازیں پڑھی ہیں' روزے رکھے ہیں اور عبادتیں کی ہیں" (طبرانی) اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنّت کی بیویاں تو وہ خواتین ہوں گی جو دنیا میں ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کرتی ہوئی دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ اپنے ایمان اور حسنِ عمل کے نتیجے میں داخلِ جنت ہونگی اور بذاتِ خود جنت کی نعمتوں کی مستحق ہونگی۔ یہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق یا تو اپنے سابق شوہروں کی بیویاں بنیں گی اگر وہ بھی جنّتی ہوں' یا پھر اللہ تعالیٰ کسی دوسرے جنّتی سے ان کو بیاہ دے گا جبکہ وہ ایک دوسرے کی رفاقت پسند کریں۔" (تفہیم القرآن جلد پنجم)

ان آیات میں اشارۃً" اور احادیث میں صراحتہً" بیان کر دیا گیا کہ ایمان اور عملِ صالح رکھنے والی خواتین پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہوگا۔ انہیں جنّتی حوروں سے زیادہ حُسن عطا کیا جائے گا' انہیں جوان اور کنواری بنا دیا جائے گا' اور انہیں اپنے دُنیوی شوہر کے ساتھ بیاہ دیا جائے گا جبکہ وہ اس کا اہل ہو یا شوہروں میں سے کسی ایک کے ساتھ بیاہ دیا جائے گا جو اس کی زیادہ اہلیت رکھتا ہو اور دنیا میں اس کے ساتھ زیادہ اچھے طریقے سے پیش آیا ہو' اور اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو تیسری صورت یہ ہوگی کہ اس کے حسب منشا اور مقام و مرتبہ کے مناسب مومنِ صالح سے بیاہ دیا جائے گا۔

آپ کو قرآن کے اس اسلوب سے جو غلط فہمی واقع ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ مرد اور عورت کی اسلامی حیثیت پر توجہ نہ کرنا ہے۔ امرِواقعہ یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور لازم و ملزوم ہیں' شوہر بیوی کیلئے اور بیوی شوہر کیلئے نعمت ہے۔ لیکن قرآنِ پاک نے عورت کو جس بلند مقام پر کھڑا کیا ہے اس تک ایک عام انسان کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ قرآنِ پاک نے مرد اور عورت میں سے مرد کو طالب اور عورت کو مطلوب قرار دیا ہے۔ اس لئے اسلامی معاشرے میں "خطبہ" پیغامِ نکاح مرد کی طرف سے دیا جاتا ہے اور مرد بارات

لے کر عورت کے گھر آتا ہے' اسے بیاہ کر لے جاتا ہے اور اس کے لئے سکونت اور نان نفقہ کا انتظام کرتا ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی اس کی عظمتِ شان کو برقرار رکھنے کی خاطر صراحتہ" مردوں کیلئے نیک سیرت' شرمیلی نگاہوں والی اور خوبصورت خواتین کو نعمت قرار دیا گیا ہے۔ رہی خواتین کے لئے نیک سیرت اور خوبصورت مردوں کی نعمت' تو اس کی طرف ضمناً" اسی صراحت میں اشارہ کر دیا گیا۔ یہ اسلوب عورت کی پاکیزگی' تقدس اور شانِ حیا کے عین مطابق ہے۔ خصوصاً باکرہ عورت سے تو جب ایجاب و قبول کے وقت نکاح کا اِذن طلب کیا جاتا ہے تو وہ بسا اَوقات زبان سے صراحتہ" اِذن دینے کی جرات بھی نہیں کرسکتی۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "اِذْنُہَا صِمَاتُہَا" اس کی خاموشی کو اِذن قرار دیا ہے۔ ایسی صورت میں کیسے ایسا انداز اختیار کیا جاسکتا ہے جس سے جنّتی خواتین مردوں کی طلب گار نظر آئیں۔ یہ انداز مناسب نہ تھا۔ اس لیے سورۃ رحمان یا کسی دوسری سورت کے اسلوب کا اسلام کے مجموعی تہذیبی نظام اور اقدار کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس اسلوب میں مرد اور عورت کے مقام' مزاج اور اوصاف کو ہر مقام پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ البتہ احادیث میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد یہ اشکال باقی نہیں رہتا کہ سورۃ رحمان کے آخر میں ذکر کردہ نعمتیں مردوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اس لئے ساری نعمتیں جو اس سورت میں ذکر کی گئی ہیں وہ بھی مردوں کے لئے مخصوص شمار نہ ہوں گی بلکہ اوّل سے لے کر آخر تک تمام نعمتیں مردوں اور عورتوں' دونوں کے لئے مشترک ہیں' حتیٰ کہ مردوں کے لئے نیک سیرت اور خوبصورت عورتیں اور عورتوں کے لئے نیک سیرت اور خوبصورت مرد ہوں گے۔ اس لئے خواتین کو کسی قسم کے احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہئے' بلکہ انہیں قرآنی ارشاد "فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی" (آل عمران ۱۹۵) کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

حرام مال کا اصل مَصرف

سوال: جدّہ میں تحریکِ اسلامی کی تمام کارکنان اعانت دیتی ہیں جو کہ مختلف مدوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ ان میں وہ خواتین بھی ہیں جن کے شوہر بنک میں کام کرتے ہیں مگر تحریک کی ذمہ دار خواتین ان کے گھر جاکر پانی کا گلاس تک نہیں پیتیں' صرف اس بنا پر کہ ان کی آمدنی جائز نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ یہ ذمّہ دار خواتین ان سے اعانت کیوں لیتی ہیں؟ جبکہ یہ رقم زکواۃ اور

صدقات میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی رقم شامل ہو جانے سے تمام رقوم ناپاک ہو گئیں؟

مجھے اس سوال کا جواب ضرور دیجئے تاکہ وہ بہنیں جن کے گھر کوئی آتا ہی نہیں، مطمئن ہو جائیں۔

جواب : حرام مال سے بچنا تو ایک صحیح طرزِ عمل ہے۔ اس پر نکیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ایک صاحب بنک کی ملازمت کرتے ہیں اور بنک کی رقم سے مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں، مہمانوں کو معلوم ہے کہ ان کی حرام مال سے ضیافت کی جارہی ہے تو انہیں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ البتہ اگر ایسے صاحب ہوں کہ ان کی کمائی خالص حرام کی نہ ہو یا وہ مہمانوں کو بطور خاص قرض لے کر حلال مال سے کھلاتے پلاتے ہوں تو ایسی صورت میں مہمانی قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسے صاحب کو اس بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے کہ حلال و حرام کا امتیاز کرنے والے ان کے ہاں کھانے پینے سے احتراز کرتے ہیں۔

اعانت کا مسئلہ بالکل الگ ہے۔ اعانت میں حرام مال بھی لیا جا سکتا ہے۔ کہ حرام مال کا اصل مصرف فُقراء اور مساکین ہیں۔ اس لئے بنک ملازم سے فُقرا، مساکین اور شعبۂ خدمتِ خلق کی مد میں رقم لینا جائز ہے۔ دونوں مسئلوں کو آپس میں خَلط مَلط کرنا مناسب نہیں ہے۔

بقیہ : تفصیلی جائزہ

رنگین ڈیزائن والا ورق چسپاں، صفحات ۵۴۰۔ ضمیمۂ اغلاط بھی دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲۰ روپے۔

مصنفوں، مورّخوں، صحافیوں اساتذہ و طلبہ اور خواتین سب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ کتاب حالات کو سمجھنے کا اسلامی فکر کے مطابق ایک ٹھوس اور وَقیع نظریہ پیش کرتی ہے۔

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اِس میں

مُترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیمُ القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیمُ القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ○ صفحات: ۱۵۸۴ ○ کاغذ: امپورٹڈ میکنیکل ○ ہدیہ: -/۱۵۰ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور ○ فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴-۲۳۶۶۶۵
پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

- جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
- جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
- جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
- اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
- دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

- بین الاقوامی قانونِ قتال کا تقابلی مطالعہ۔
- اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔
- جہاد کے مخالفین اور معترضین کا مسکت جواب۔
- درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ○ صفحات: ۶۰۰ ○ قیمت: -/۷۲، ڈیلکس ایڈیشن: -/۹۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور ○ فون: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵

یو نسپلٹیاں چلانے کا اختیار ہو گا۔ یہ بھی اس لیے کہ اسرائیل اپنی حدود میں غیر یہودیوں کی ایک عظیم تعداد کی موجودگی کے درد سر سے نجات حاصل کر سکے' اور اس کے دامن پر عربوں کی اتنی بڑی تعداد کو حقوقِ شہریت سے محروم کر دینے کے دھبے پر پردہ پڑ جائے۔

یہ شرائط کیا تھیں؟ فلسطینیوں کا کوئی وفد اس بات چیت میں شریک نہیں ہو گا۔ اگر فلسطینی شریک ہوں گے تو اردن کے وفد کی حیثیت میں۔ اردن کے وفد میں بھی جس فلسطینی کو اسرائیل شریک ہونے دے گا وہ بیت المقدس کا رہنے والا نہ ہو گا (کیونکہ بیت المقدس اب اسرائیل کا اٹوٹ انگ ہے۔ اگرچہ اسرائیل کے اس قبضہ کو دنیا نے' یہاں تک کہ امریکہ نے بھی ' ابھی تک تسلیم نہیں کیا' مگر اب اس طرح تسلیم ہو گیا) ' وہ کوئی جلا وطن فلسطینی بھی نہیں ہو گا' اس کا کسی قسم کا تعلق پی ایل او سے بھی نہیں ہو گا۔ پھر شامل ہو گا کون؟ جو مغربی حصہ اور اردن میں رہائش پذیر ہو' اور جس کا نام اسرائیل ویٹو نہ کرے۔ اس کی مثال حیدر شفیع جیسا فلسطینی ہے' جو سیکولر لیفٹسٹ ہے اور بنیاد پرستی اور انتفاضہ کا سخت مخالف ہے۔ دنیا میں گفت و شنید کی تاریخ میں شاید یہ پہلی نظیر ہو گی کہ ایک فریق اس بات پر بھی ویٹو کا حق رکھتا ہو کہ دوسرے فریق کی نمائندگی کون کرے گا۔

دوسرے شرکاء کے سلسلہ میں بھی اسرائیل اور امریکہ نے اپنے مفادات کے مطابق شرائط طے کیں۔ اقوام متحدہ کو بحیثیت مندوب کے شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بڑی عجیب بین الاقوامی کانفرنس تھی' جہاں خود اقوام متحدہ کو بھی پوری شرکت کی اجازت نہ ملی ۔ وہی اقوام متحدہ جو امریکہ کی جنگِ خلیج کی پوری مدت میں آگے رکھی گئی۔ برطانیہ اور فرانس بھی اس میں شریک نہیں کیے گئے' حالانکہ ان کا مشرقِ وسطیٰ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے کسنجر کی پالیسی کا' امریکہ کی پالیسی کا ' کہ یورپ اور جاپان کو مشرقِ وسطیٰ کے بارہ میں بات چیت سے بالکل باہر رکھا جائے۔ روس کانفرنس بلانے میں امریکہ کے ساتھ شریک ضرور ہے' لیکن ایسے وقت جب اس کی طاقت اور موقف یکسر بدل چکے ہیں۔ اگر روس کی طاقت اور موقف میں تبدیلی نہ آئی ہوتی تو یہ کانفرنس کبھی نہ منعقد کی جاتی۔ درحقیقت یہ وہ بین الاقوامی کانفرنس ہے ہی نہیں جس کا مطالبہ عرب کر رہے تھے۔ میڈرڈ کانفرنس کے بعد ' شامیر کے بیان کے مطابق ' یہ سارے شرکا پھر کبھی بھی مل کر نہیں بیٹھیں گے' نہ اس کانفرنس کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ کانفرنس کے بعد ہر عرب ریاست براہ راست اسرائیل سے مذاکرات کرنے کی پابند ہے۔ ایجنڈے کے بارہ میں بھی شرائط طے کی گئیں۔ "امن کے بدلے علاقے" چھوڑ دینے کا ذکر ہو گا'

لیکن یہ بات واضح رہے گی کہ اسرائیل ایک انچ زمین سے بھی دست بردار ہونے کو نہیں۔ فلسطینی شریک ہو سکیں گے' لیکن فلسطینی ریاست کا کوئی ذکر نہیں ہو گا۔

سیکولر فلسطینی جو کچھ میدان میں کھو چکے تھے وہی اب باقاعدہ میز پر اسرائیل کے حوالے کرنے کے لئے کانفرنس میں آبیٹھے ہیں۔ لیکن اب جن فتوحات پر خوشیوں کے شادیانے بجا رہے ہیں وہ بس اس قدر عظیم ہیں کہ (۱) اُردنی وفد میں شامل فلسطینی نمائندوں کی فہرست امریکی وزیر خارجہ بیکر نے اسرائیل کو باقاعدہ دکھا کر اس کی منظوری حاصل نہ کی (اگرچہ اسرائیل کو یقین دہانی کر دی گئی کہ کوئی فلسطینی مندوب ایسا نہیں جس پر ان کو اعتراض ہو سکے) (۲) میڈرڈ میں ان کا استقبال علیحدہ سے کیا گیا' ان کو لیموزین دی گئی ' اور پوری ڈپلومیٹک حیثیت بھی (۳) کانفرنس میں ان کو بولنے کے لئے اتنا ہی وقت دے دیا گیا جتنا اردن اور اسرائیل کے وفود کو۔

جہاں تک باقی عربوں کا تعلق ہے تو امریکہ کی جنگِ خلیج کے بعد اب وہ جس ضعف اور کسمپرسی کے عالم میں ان مذاکرات میں حصہ لے رہے ہیں' اس کے پیشِ نظر کچھ پانے کا تو سوال ہی نہیں' سب کچھ کھو کر 'جوئے میں ہار کر' ہی میز پر سے اٹھیں گے۔

تو ' امریکہ اور اسرائیل اس کانفرنس سے کیا' اور کس طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ جب ایک طرف فلسطینی بہت ہی محدود اختیارات حاصل کرنے کے لئے اسرائیل کے سامنے ناک رگڑ رہے ہوں' تو تمام عرب ملک علیحدہ علیحدہ اسرائیل سے اپنی اپنی شرائط طے کر لیں۔ ان ممالک میں امریکہ کے پرانے یاران وفادار بھی ہیں' خلیج جنگ کے احسان کے بوجھ تلے دبے ہوئے حکمران بھی ہیں' وہ ملک بھی ہیں جو اپنے اوپر اللہ کے بعد (بلکہ شاید اس سے پہلے ہی) زمین پر امریکہ ہی کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں' اور وہ بھی جو برملا اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ فلسطینی اسرائیل سے کوئی معاملہ کریں نہ کریں،ہم ضرور ہی کریں گے۔ امریکہ اور اسرائیل کا منصوبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطینی بالکل تنہا رہ جائیں گے۔ سارے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ رہے گا۔ ہر متعلقہ عرب ملک اسرائیل سے الگ الگ کوئی نہ کوئی معاہدہ کر ہی لے گا۔ لیکن اگر کسی سے کوئی معاملہ طے نہ ہو سکا ' تو خلیج جنگ کی طرح کسی اقتصادی و فوجی کارروائی سے اس کو سیدھا کر لیا جائے گا۔

اس طرح عرب ممالک جب اسرائیل سے امن کے معاہدوں میں بندھ جائیں گے تو ان کو غیر مسلح کیا جا سکے گا۔ ان کی معیشتوں کے دروازے بھی اسرائیل اور مغرب کے لئے کھول دیئے جائیں گے۔ اس طرح اسرائیل ' جس کو امریکہ سالانہ ایک ہزار ڈالر فی کس کے حساب سے

امداد دیتا ہے' جس کی فوجی طاقت دنیا کی چوتھی بڑی طاقت ہے' جس کے پاس کم سے کم دو سو نیوکلیئر بم ہیں' اور جو مغرب و امریکہ کے عزائم پورے کرنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے' سارے مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم کرلے گا۔ اس کو فوجی بالا دستی بھی حاصل ہوگی' اور علاقہ کی معیشت پر بھی اس کا کنٹرول ہو گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے' دو طرفہ مذاکرات کے ساتھ ساتھ ایک علاقائی کانفرنس بھی اس منصوبہ میں شامل ہے۔ جہاں پانی' معیشت' ماحولیات' وغیرہ جیسے مسائل کے حوالے سے' کسی دو طرفہ معاہدہ سے پہلے ہی' عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ نتھی ہو جائیں گے۔ عرب ممالک' کمزور و ضعیف' متفرق و منتشر' ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا' سیاسی طور پر اپنے ہی ملکوں کے عوام سے بیگانہ اور ان سے برسرِپیکار' اخلاقی طور پر دیوالیہ -- امریکہ اور اسرائیل کے دست نگر اور باجگزار بن کر رہیں گے۔ اور اسپین کے دور طوائف الملوکی کا نقشہ تازہ ہو جائے گا۔ پھر' اگر "بنیاد پرستی" سر اٹھائے گی' تو مسلمان حکومتیں خود ہی اس سے نپٹ لیں گی۔

امریکہ کی نیو ورلڈ ڈپلومیسی کا دائرہ کچھ مشرقِ وسطیٰ ہی تک محدود نہیں' اگرچہ مشرقِ وسطیٰ کے لیے اس کا منصوبہ اس ڈپلومیسی میں شہ رگ (یا کنگ پن) کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر مسلمان ملک جو کسی طرح بھی طاقتور ہو' سرتابی کی مجال کرے' جہاں "بنیاد پرستی" کے سر اٹھانے کا خطرہ ہو' وہ دباؤ کی زد میں ہے۔ آج یا کل' جلد یا بدیر' اس کی باری آنیوالی ہے۔ پاکستان اور لیبیا پر دباؤ اسی ڈپلومیسی کا حصہ ہے۔

پاکستان سے امریکہ کے مطالبات بہت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نیوکلیئر بم بنانے کا ارادہ ترک کردے' اور اب تک اس سمت میں جتنی پیش رفت کی ہے اس کو لپیٹ کر پیچھے دھکیل دے' اپنی ساری ایٹمی تنصیبات اور پروگراموں کو بین الاقوامی (یعنی امریکی) معائنہ کے لئے کھول دے۔ (جیسا "بین الاقوامی" معائنہ آج کل عراق میں ہو رہا ہے)۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو پریسلر ترمیم کے تحت ---جو خاص پاکستان ہی کے لئے وضع کی گئی ہے ---- اس کی ساری امداد' (جو امداد سے زیادہ قرض کا جال ہے)' یہاں تک کہ طلبہ کے وظائف تک' تو بند کی ہی جا چکی ہے' دوسرے ممالک سے بھی یہی کچھ کرایا جائے گا۔ تجارت کے راستے بند کئے جائیں گے۔ دنیا میں اس کو یکہ اور تنہا کر کے چھوڑا جائے گا۔ ایٹمی تنصیبات کی تباہی کے لیے' بھارت اور اسرائیل سے اچانک محدود حملے بھی کرائے جا سکتے ہیں۔ یا بھارت سے جنگ بھی چھڑوائی جا سکتی ہے' تاکہ

سرتابی کا مزہ چکھایا جا سکے۔

دوسرے یہ کہ وہ کشمیر میں جہاد کی حمایت بالکل ترک کر دے اور مجاہدین کی ہر قسم کی امداد سے دست کش ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف مختلف النوع اقتصادی ' سیاسی ' اور فوجی کارروائیوں کا راستہ کھول دیا جائے گا۔

تیسرے یہ کہ وہ افغانستان میں کسی اسلامی حکومت کو برسر اقتدار لانے کا خیال ترک کر دے۔ ویسے تو ایسی حکومت دنیا میں کہیں بھی قابل قبول نہیں' اور ہر جگہ مغربی تہذیب کے لئے ایک خطرہ ہے' لیکن افغانستان میں تو خاص طور پر بالکل ہی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ اس طرح ترکی' ایران' افغانستان اور وسط ایشیا کی وہ مسلمان ریاستیں جن پر روس نے قبضہ کر لیا تھا آپس میں مل کر' مشرق وسطی کے بعد' مسلمانوں کا دوسرا اہم اور زیادہ طاقتور بلاک بن سکتے ہیں۔ افغانستان کو اس وسیع ' اہم' اور حساس علاقہ میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ پھر' اب بچے کھچے ' شکستہ و پراگندہ ' روس کا تحفظ بھی نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنڈے پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً" وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے آزاد اور طاقتور ہو جانے کے خطرے سے۔ بالٹک ریاستوں کی آزادی فوراً تسلیم کر لی جا سکتی ہے' دوسری ایسی ریاستوں کی آزادی پر بھی حمایت یا خاموشی اختیار کی جا سکتی ہے' لیکن مسلمان ریاستوں کی آزادی کے ذکر سے ہی خطرے کے الارم بجنے لگتے ہیں۔

چوتھے' پاکستان اس علاقے میں کسی وسیع تر مسلمان بلاک کا خواب دیکھنا چھوڑ دے' اور مغرب و شمال کی طرف دیکھنے کی بجائے مشرق کی طرف دیکھے' اور بھارت کی بالادستی کے تحت زندگی بسر کرنا قبول کر لے۔ یہ کوئی غیر اہم بات نہیں ہے کہ محض ایک پاکستانی وفد کے وسط ایشیا جانے ' اور ثقافتی ' اقتصادی اور سیاسی روابط بڑھانے کے لئے پہلا قدم اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بریفنگ اخباروں میں آجائے کہ اس اقدام سے امریکہ کو سخت تشویش ہے' اور وہ پاکستان اور وسط ایشیا کے درمیان روابط کے بڑھنے کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔

دوسرا معاملہ لیبیا کا ہے۔ صدر قذافی کے استبداد یا بیرون ملک غیر قانونی کارروائیوں کی تائید ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ لیبیا کے اندر اور باہر' لیبیا کے باشندوں یا بے گناہ انسانوں کو ہلاک کرنے کی کارروائیوں کی یقیناً" مذمت کرنا چاہیے۔ لیکن امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں نے دھونس اور تشدد کی جو پالیسی لیبیا کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے' وہ کم قابلِ مذمت نہیں۔ لیبیا کی غلط کارروائیاں امریکہ کو یہ جواز فراہم نہیں کرتیں کہ وہ اپنی فوجی قوت کے ساتھ اس پر چڑھ

ڑے' اور بے گناہ عورتوں اور بچوں اور مردوں کو ہلاک کرے۔ یہ کام وہ پہلے بھی کر چکا ہے' اب پان امریکن کے جہاز کی تباہی کی تحقیقات کے نتائج کا اچانک انکشاف کر کے لیبیا کے ف فوجی کارروائی کے لئے زمین ہموار کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ لیبیا نیو ورلڈ آرڈر کی راہ ، ایک کانٹا ہے۔ ورنہ پان امریکن کے جہاز کے تو ٹکڑے ٹکڑے جمع کر کے ان پر لیبیا کا نام ہ لیا گیا' مگر ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ کو فلسطین میں اقوام متحدہ کے نمائندے کاؤنٹ برناڈوٹ کو اسرائیلی ہشت گردوں نے ' یروشلم کے یہودی علاقے میں ایک روڈ بلاک پر 'گولی مار کر ہلاک کر دیا' خود امریکن کونسل واسن کو ۲۶ مئی ۱۹۴۸ کو گولی مار دی گئی' بہاولپور کے نزدیک جہاز تباہ کر کے نہ صرف پاکستان کے صدر اور اس کے جنرلوں کو ہلاک کر دیا گیا بلکہ امریکن سفیر اور فوجی اتاشی بھی ہلاک ہو گئے' اسرائیل رات دن نہتے فلسطینیوں کو ختم کر رہا ہے' نہ تحقیقات ہوتی ہیں' اگر ہو جائیں تو نہ ان کے نتائج کا اعلان ہوتا ہے 'نہ مقدمہ چلتا ہے' نہ دہشت گرد پکڑا جاتا ہے' نہ کوئی اور کارروائی کی جاتی ہے۔

صدام حسین نے کویت پر حملہ کر کے' اور پھر امریکی فوجیوں کے سامنے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال کر جس طرح نیو ورلڈ ڈپلومیسی کی کامیابی کی راہ ہموار کی ہے' اس کے صلہ میں اس کا اقتدار تو اب تک سلامت ہے۔ مگر عراق کی فوجی قوت کی مکمل تباہی ' اس کی معیشت کی شکست و ریخت ' اور عراقی عوام کو بھوک اور بیماری سے ہلاک کرنے کے لئے جو بے رحمانہ کارروائی جاری ہے' وہ بھی اسی منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ دنیا اگر اس پر خاموش ہے تو کیا گلہ کیا جائے' ماتم کا مقام تو یہ ہے کہ وہ مسلمان جن کی زبانیں کویت پر عراقی جارحیت کے خلاف شمشیر برہنہ تھیں' اب عراق کے خلاف امریکہ کی چیرہ دستیوں پر گنگ ہیں۔

۱۴۹۱ اچانک پیش نہیں آگیا تھا۔ نہ ۱۹۹۱ اچانک نمودار ہو گیا ہے۔ یہ دنیا اندھیر راجا کی اندھیر نگری نہیں ہے۔ نہ یہ کسی حادثہ اور اتفاق کی پیداوار ہے' نہ یہاں تدبیر امر اور لیل و نہار کی گردش حادثہ اور اتفاق کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ یہ دنیا حق پر پیدا کی گئی ہے ' حق پر قائم ہے۔ یہاں آسمان سے زمین تک تدبیر امر اس کے ہاتھ میں ہے جو رب العالمین ہے' عالم الغیب والشھادہ ہے' عزیز و رحیم ہے' حکیم و حمید ہے۔ اسی کی سنت یہاں کارفرما ہے۔ **وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا . . . تَحْوِيلًا**۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کل جو کچھ ہوا تھا' وہ کیوں ہوا تھا' اور آج کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔ قوموں کے لئے کوئی ایسا مستقبل اس طرح

مقدر نہیں کہ اس سے مفر ممکن نہ ہو' جس کا ظہور پذیر ہونا ناگزیر ہو۔ ہاں' سنت اللہ سے مفر ممکن نہیں۔ جو کچھ کھویا وہ اس سنت کے تحت' جو کچھ پا سکتے ہیں وہ بھی اسی سنت کے تحت۔

اسپین میں مسلمانوں کے ۷۸۱ سالہ تہذیبی تفوق اور سیاسی غلبے کا دور حرفِ غلط کی طرح کیوں مٹ گیا؟ پہلا بڑا سبب ان کا باہمی افتراق و انتشار' نزاع و جدل' اور جنگ و خون ریزی ہے۔ عصبیت کی وجہ سے بھی' اقتدار و حکومت کے لالچ کی وجہ سے بھی' عیش و عشرت اور دولت و دنیا کی طلب و ہوس کی وجہ سے بھی۔

اسپین کے مسلمانوں میں تین گروہ تھے۔ ایک طرف عرب تھے' تو دوسری طرف بربر' اور تیسری طرف اسپینی مسلم (جو یا تو مخلوط اولاد تھے یا بالکل نو مسلم' اور مولدون کہلاتے تھے)۔ خود عرب' کلبی و قیسی' یمنی و شامی وغیرہ' بے شمار گروہوں میں تقسیم تھے۔ سب قبیلوں اور گروہوں کے درمیان مستقل آویزش اور کشمکش تھی۔ سب کو ایک دوسرے سے سیاسی' معاشی اور تہذیبی شکایات تھیں۔ نو مسلموں کو پیدائشی مسلمانوں سے' غیر عربوں کو عربوں سے' فرق و امتیاز اور استحصال کا گلہ تھا۔ جوڑ توڑ اور سازشیں بھی تھیں' کشت و خون بھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف فرانس کے میدانوں میں شکست کھائی' اور پیش قدمی رک گئی۔ دوسری طرف شیرازہ بار بار بندھتا اور پھر بکھرتا رہا۔ ہر افتراق و انتشار سے وہ عیسائی حکمران بھرپور فائدہ اٹھاتے جن کی ریاستیں شمال میں موجود تھیں۔ اور وہ بھی جو مسلم اسپین کے باشندے تھے۔

۷۱۱ میں طارق بن زیاد کی فتح اسپین کے بعد سے ہی قتال و جدال کا یہ سلسلہ چھڑ گیا' اور نصف صدی تک جاری رہا۔ یمنی گورنر مارا جاتا یا معزول کیا جاتا تو قیسی آتا' وہ جاتا تو یمنی آتا۔ اموی دور ۱۰۳۰ میں ختم ہوا' مگر آخری ۲۲ سال میں ۱۰ حکمران تخت پر بیٹھے۔ ان کے خاتمہ کے ساتھ ہی اسپین میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ مرابطین اور موحدین کے ادوار آئے' لیکن ان باہم برسرپیکار چھوٹی ریاستوں سے جان نہ چھوٹی۔

باہمی نفاق و افتراق اور کشت و خون سے فائدہ اٹھاکر عیسائی حکمران اپنا اقتدار وسیع اور مستحکم کرتے رہے۔ ایک مسلمان ریاست کو دوسری مسلمان ریاست سے لڑاتے رہے۔ کبھی ایک کی پشت پناہی کرتے' کبھی دوسرے کی۔ اس طرح ایک ایک کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہڑپ کرتے رہے۔ بالآخر ۱۲۳۸ میں صرف غرناطہ کی ایک چھوٹی سی ریاست باقی رہ گئی۔ ۱۴۹۱ میں وہ بھی اپنے آخری انجام سے دوچار ہوگئی۔

عیسائیوں کو تو مسلمان قبیلوں اور ریاستوں کے باہمی جنگ و جدل سے فائدہ اٹھانا ہی تھا'

بڑی المناک داستان تو مسلمانوں کے خود عیسائیوں سے مدد لینے ' ان کا آلۂ کار بننے ' ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں ہی کو تباہ و برباد کرنے کی داستان ہے۔ تاریخ اسی دلخراش کہانی سے بھری ہوئی ہے۔ یوسف بن تاشفین آیا تو مسلمان ریاستوں نے مل کر عیسائیوں کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے پکارا۔ اشبیلیہ کے لوگوں نے عیسائیوں کے دربار میں ایک مسلمان فوجی افسر کو لکھا کہ "عیسائیوں کے بادشاہ کو ہماری فریاد سناؤ' اور اس کی مدد حاصل کر کے مرابطین کا جوا ہمارے کندھوں سے اتروا دو۔ مرابطین سے آزادی کے بعد ہم عیسائی بادشاہ کو سابق سے زیادہ خراج ادا کریں گے"۔ قرطبہ کے امرا کہتے تھے کہ "بادشاہ لیون سے مل جاؤ اور حسب دستور سابق اس کو خراج دو۔ ان مرابطین سے گلو خلاصی کی جو تدبیر ہوگی وہ اچھی ہوگی"۔

سب سے زیادہ جگر خراش تو غرناطہ کے آخری ایّام کی کہانی ہے۔ مولائے حسن وہ آخری حکمران تھا جس نے عیسائیوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ جب مسلمان زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے تو عیسائیوں نے اس کے دونوں بیٹوں ' ابوعبداللہ محمد اور یوسف سے اس کے خلاف بغاوت کروا دی۔ اس نے اپنے بیٹے کو شکست تو دے دی ' لیکن عیسائیوں کے مقابلے سے دست کش ہونا پڑا ۔ تنگ آکر جب اس نے حکومت اپنی بھائی الزاغل کے حوالے کر دی ' تو عیسائیوں نے ابوعبداللہ کو مسلح کر کے اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ الزاغل کس کس کا مقابلہ کرتا۔ ایک شہر پر ابوعبداللہ کا قبضہ ہوتا ' تو دوسرے پر فرڈی ننڈ کا۔ اس نے بھی اپنے بھتیجے سے بچنے کے لیے فرڈی ننڈ کے ساتھ صلح کرلی۔ مگر بالآخر الزاغل اور ابوعبداللہ دونوں ہی جلا وطن ہو کر کسمپرسی کی زندگی اور موت سے دوچار ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں اور امرا میں بے شمار عیسائیوں کے ایجنٹ تھے۔ اس وقت عیسائیوں کی تہذیبی و ذہنی غلامی کا تو کوئی سوال نہ تھا' لیکن سیم و زر کے عوض ان کے ضمیر اور زبانیں خرید لی گئی تھیں۔

مسلمان حکمران عیسائیوں سے ساز باز کرتے 'عوام کو بے خبر رکھا جاتا ' اور پھر ان کو بھیڑ بکری کے ریوڑوں کے طرح ہانک دیا جاتا۔ علما و فقہا فتوے جاری کرتے' مگر ان کی کوئی نہ سنتا۔ مسلمان عوام پیچ و تاب کھاتے' لیکن بے بس و لاچار خاموش تماشائی بنے رہتے ۔

۱۹۹۱ نمودار ہونے کے اسباب اور آج کی صورتحال کیا ۱۴۹۱ سے کچھ زیادہ مختلف ہے؟

عرب ترکوں کے خلاف' مصری یمن میں ' عراق اور کویت ' پنجابی اور بنگالی ------

مسلمان ہی ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوتے رہے ہیں' اور ہو رہے ہیں۔ مغرب

کی سیکولر عیسائی قوتیں ان کو پارہ پارہ کرتی رہی ہیں' اور اپنا زیر نگیں بناتی رہی ہیں ۔ میڈرڈ کانفرنس امریکہ کی جنگ خلیج کے پس منظر میں شروع ہوئی ۔ اس میں عرب کو عرب کے 'یا صحیح معنوں میں مسلمان کو مسلمان کے' خلاف لڑایا گیا۔ مغرب کے سارے ممالک نے مل کر پہلے عراق کی طاقت کا ہوّا کھڑا کیا' پھر اس کو تباہ و برباد کر دیا ۔ اردن میں "سیاہ ستمبر" کا فلسطینیوں کا قتلِ عام ہو' یا لبنان میں شام کی فوجی کارروائی ' بیروت کے کیمپوں میں فلسطینیوں کا قتلِ عام ہو یا غزّہ میں ان کی پکڑ دھکڑ ' یہ مسلمان ہی ہیں جو مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں۔ اگر مصر کیمپ ڈیوڈ میں پہلے ہی فلسطینیوں کو چھوڑ چکا ہو' اور کویت و سعودی عرب برملا اعلان کریں کہ فلسطینی آئیں یا نہ آئیں ہم اسرائیل سے ضرور صلح کریں گے ' تو فلسطینی کیوں پیچھے رہتے۔

عصبیّت کی پُوجا ' باہمی افتراق اور جنگ و جدال ' غیروں کی کاسہ لیسی ------ یہ سب خود ایک بنیادی مرض کا نتیجہ ہیں۔ اور وہ یہ کہ مسلمان امت اپنے اصل مقصد و مدعا' اپنے مشن ' بلکہ کسی قسم کے بھی مقصد و مشن سے خالی ہوگئی۔ حبل اللہ چھوڑ کر ' اس کو حبل الناس کے علاوہ کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان تھا کہ "صرف خدائے واحد کی پرستش کرو" ------- ہم نے نسل ' رنگ ' قبیلے' زبان جیسے بتوں کی پوجا شروع کر دی ۔ جس آگ کے گڑھے سے اس نے ہم کو نجات دی تھی' ہم جا کر سر کے بل اسی میں گر گئے۔ اس کا حکم تھا کہ "آپس میں جھگڑا نہ کرنا ' ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"۔ ہم نے تنازعات کی جنگ چھیڑ دی۔ پھر ہم کمزور بھی پڑ گئے اور ہماری ہوا بھی اکھڑ گئی ۔ اس کے نبیؐ کا ارشاد تھا "کہ دیکھو ' میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔" ہم نے مسلمان کو مسلمان بھائی کے بجائے اموی اور عباسی 'عربی اور عجمی ' عرب اور بربر' یمنی اور مصری ' عرب اور ترک ' پنجابی اور بنگالی ' سندھی اور مہاجر ' عراق اور کویت بنا کر بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہایا۔

اس نے یہ بھی فرمایا تھا کہ باہمی عداوت و بغض کا پھیلنا تو اس بات کی سزا ہے کہ جو ہدایت تم کو دی گئی ہے' اور جس کی دعوت و غلبے کا مشن تمہارے سپرد کیا گیا ہے' تم اس کو فراموش کر دو۔ ہم نے بالکل یہی کیا ' اور عیسائیوں کی طرح عداوت و بغض کا شکار ہوگئے۔ پھر ان کے لئے ہمارے شہروں کے دروازے کھل گئے' اور وہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ہر جگہ ہمارے اندر گھس کر ہمارے آقا و مالک بن گئے۔ اس نے خبردار کر دیا تھا کہ جو ہم سے نقضِ میثاق کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں' ہم ان کے دل سخت کر دیتے ہیں ' ان پر لعنت کرتے ہیں ' اور ان پر

باہر کی قوموں کو چڑھا لاتے ہیں۔ ہم نے نقضِ عہد کیا' تو ہم پر اس کے یہ سارے مواعید صادق ہو گئے۔

بظاہر تو حالات تاریک اور مایوس کن ہیں۔ امکان یہی ہے کہ ابھی اور زیادہ تاریک تر اور مایوس کن ہی ہوں گے۔ لیکن ۱۹۹۱ ' ۱۴۹۱ نہیں ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی شعاعیں بھی چمک رہی ہیں۔

آج مسلمان عروج کے بعد زوال کی پستی میں نہیں گر رہے' بلکہ زوال کی پستی کے بعد ان میں بیداری کی ایک لہر بڑھ رہی ہے۔ انکی بیداری کی یہ لہر ہی مغرب' امریکہ ' اور اسرائیل میں اضطراب و بے چینی اور نیو ورلڈ آرڈر کا اصل باعث ہے۔ یہ لہر اب سیکولر عناصر کی رہنمائی میں مغرب کے سیاست تسلط سے برائے نام آزادی کی لہر نہیں ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں سید مودودیؒ ' حسن البناؒ شہید اور ان جیسے بے شمار دیگر رہنماؤں کی جدوجہد کے نتیجہ میں "آج دنیا کے چپہ چپہ پر مردوں اور عورتوں کی ' بالخصوص نوجوانوں کی ' نسلیں کی نسلیں جنم لے چکی ہیں' جو اللہ اور رسولؐ سے اپنے عہد وفا کو وفا کرنے کی سعی و جہد میں لگی ہوئی ہیں۔ امریکہ کے غلبے کے' نااہل اور بیرونی تہذیب و قوت کے ایجنٹ یا پرستار حکمرانوں کے ' ہر مسلمان ملک میں خود ان کے حکمرانوں کے طرف سے مسلمان عوام کو ظلم و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ کے بے بس و ناکارہ بنانے کی کوششوں کے باوجود یہ لہر بڑھتی ہی جارہی ہے۔

اس لہر کی علامتیں بے شمار ہیں۔ اسلامی تحریکیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ خود امریکہ اور یورپ میں اسلام کی دعوت کا کام ہورہا ہے۔ نئی نسلوں کی اسلام سے وابستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افغانستان میں ' حوصلہ شکن نااتفاقیوں اور "ہنوز دلّی دوراست " کے باوجود ' نہتے مجاہد ایک سپر پاور کو ہزیمت اور شکست و ریخت سے دوچار کرچکے ہیں ۔ ایران کے انقلاب میں کتنی ہی خامیاں سہی' اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام میں اب بھی اتنی قوت ہے کہ وہ ایک پوری قوم کو کھڑا کر دے اور بیرونی طاقتوں کے ایک زبردست مہرے کو اٹھا کر پھینک دے۔ کشمیر کے بے سرد سامان اور بے سہارا مسلمان بھی جہاد کی راہ پر گامزن ہیں۔ وسط ایشیا کی ریاستوں میں مسجدیں بھرتی جارہی ہیں ' اور دین سے تعلق دن رات فزوں تر ہو رہا ہے۔

ادھر' امریکہ بھی معاشی طور پر کمزور ہو رہا ہے۔ اس کی بالادستی کو چیلنج کرنے والی قوتیں اٹھ رہی ہیں۔ خود امریکی اصحاب فکر سنجیدگی کے ساتھ جاپان کے ساتھ ایک جنگ کی پیشین گوئی

کر رہے ہیں۔ یورپ بھی امریکہ کا حریف بننے کی راہ پر آگے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ ہی واحد قطب ہو' یہ امکان روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔

مگر سنت اللہ کے تحت یہ نہیں ہوتا کہ روشن مستقبل کا پھل من و سلوی کی طرح خود بخود کسی قوم کی جھولی میں ٹپک جائے۔ اگر من و سلوی بغیر استعداد کے برسنے بھی لگے' تو مسور اور پیاز لہسن کی کشش ذلت و مسکنت کے گڑھے ہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے بامِ عروج کا کوئی راستہ سعی و جہد کی علاوہ نہیں۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى' اللہ تعالیٰ کا ازلی و ابدی قانون ہے۔

اس لئے اس بھنور سے نکلنے کے لئے امت مسلمہ کو کمر کس کے کھڑا ہونا ہوگا۔ جو چیلنج درپیش ہیں ان کی نوعیت و حقیقت کا ادراک کرنا ہوگا۔ ان کا مؤثر جواب تیار کرنا ہوگا۔ یہ سمجھنا ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ کیوں ہوا ہے' اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔ اپنے گھروں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ جو خود کو نہ بدلیں' ان کی حالت کبھی نہیں بدل سکتی۔ حکمت و تدبر' دلیری و جرات اور اجتہاد و جہاد کے ذریعہ اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ اس یقین سے سرشار ہو کر اپنی حکمت عملی بنانا ہوگی کہ ہمارے پاس ایک ایسی دعوت ہے جو کڑے سے کڑے دشمن کو بھی مسخر کر سکتی ہے۔ اتنے بڑے دشمن کا مقابلہ صرف نفرت اور گالیوں' نعروں اور مظاہروں سے نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری نہیں کہ جو دشمن ہے' وہ ہمیشہ دشمن رہے۔ عمر بن الخطابؓ ہوں' یا ہلاکو خان کی اولاد' کعبہ کو صنم خانوں سے پاسبان ملتے رہے ہیں اور مل سکتے ہیں۔

امت کو ایک عظیم چیلنج درپیش ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ چیلنج ان کے لیے ہے جو اسلام کے علمبردار ہیں' جو احیائے اسلام کے داعی ہیں' اور جو اقامتِ دین کے دعویدار ہیں۔ کیا وہ ایمان و عمل' فکر و نظر اور اجتہاد جہاد کے ذریعہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے؟

امیر جماعت قاضی حسین احمد صاحب کی ہدایت پر نیو ورلڈ آرڈر کے موضوع پر پروفیسر خورشید احمد صاحب تفصیلی اشارات تحریر کر رہے ہیں۔ پہلی قسط ماہ اکتوبر کے شمارہ میں آچکی ہے۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب اپنی علالت کی وجہ سے بقیہ قسطیں نہ لکھ سکے ہیں' اس لیے اس شمارہ کے لئے' امیرِ جماعت کی ہدایت پر' خرم مراد صاحب نے میڈرڈ کانفرنس کے موضوع پر اشارات لکھے ہیں۔ ان اشارات کا تعلق بھی نیو ورلڈ آرڈر کے موضوع سے ہے' لیکن انشاء اللہ پروفیسر خورشید احمد صاحب کی باقی ماندہ قسطیں بھی جلد حاضرِ خدمت کی جائیں گی۔ (ادارہ)

ہمارے تازہ کیسٹ

- **اجتماع ۶۳ کی صوتی رُوداد :**

سیّد مودودیؒ کے دونوں خطاب، خورشید احمد کی تقریر اور ماہر القادری کا منظوم تاثر۔

- **قرآن اور ہم :**

خرم مراد کا ملتان میں حیات آفریں خطاب۔ سیرت النبیؐ کا پیغام۔ قرآن کو اختیار کرو فلاح پا جاؤ گے۔

- **کیسٹ ڈائجسٹ ۳ :**

بچوں کے لیے کہانیاں، لطیفے، نظمیں، چٹکلے۔

- **ایک خدا ــ ایک اُمّت :**

توحید اور رسالت کے عقائد پر سید مودودیؒ اپنے مخصوص، دھیمے لیکن بہا لے جانے والے انداز میں استدلال پیش کرتے ہیں۔ ۳۰ برس قبل کی بالکل صاف آواز۔

- **خدمتِ انسانیت :**

خدمت بھی دعوت کا ایک اُسلوب ہے اور ایمان کا تقاضا بھی! ــ خرم مراد سے سُنیے

ــ تحریکی مکتبوں سے حاصل کیجیے یا ہمیں لکھیے :

سمع و بصر

۱۸۔ امبر موٹل۔ نرسری، کراچی ۷۵۴۰۰
فون : ۱۸ــ۴۳۱۱۵۹

اس قوم کو صرف
نظامِ حق ہی بچا سکتا ہے

پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ شریعت سے مراد کیا ہے؟ بعد میں میں یہ عرض کروں گا کہ اس کے نفاذ کا کیا مطلب ہے اور آخر میں یہ بتاؤں گا کہ پاکستان میں اس کے نفاذ کے امکانات کیا ہیں اور کیا ضروری شرائط ہیں۔

① شریعت سے مراد

شریعت سے مراد محض قانون نہیں ہے جس کو عدالتوں کے ذریعے نافذ کیا جائے۔ شریعت قانون کے ہم معنی نہیں۔ شریعت سے مراد زندگی کا پورا نظام ہے جو عقائد و ایمانیات سے شروع ہوتا ہے' اور عبادات و اخلاقیات پر آتا ہے۔

② شریعت کے تقاضے

(ا) ایمان کی آبیاری اور پختگی

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم جو شریعت ہی کو نافذ کرنے کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے آپؐ نے تیرہ برس مکّہ معظمہ میں' اس کے بعد مدینہ منوّرہ میں اپنی ساری طاقت صرف فرمائی تھی کہ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں ایمان کی طاقت بٹھا دیں کیوں کہ یہ شریعت اس وقت تک نافذ ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس کے چلانے والوں میں ایمان موجود نہ ہو' اور جن پر وہ چلائی جائے ان کے اندر بھی ایمان نہ ہو' اگر ایمان موجود نہ ہو تو ممکن نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کیا جا سکے اور ممکن نہیں ہے کہ جس آبادی پر اس کو نافذ کیا جا رہا ہے وہ اس کو برداشت کر لے مثال کے طور پر میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ حدودِ شرعیہ میں سے ایک حدِ شرعی یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اس کے اوپر عمل وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان ہو۔ وہ سچے دل سے سمجھتے ہوں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ سچے دل سے یہ سمجھتے ہوں کہ محمد صلّی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسولؐ ہیں۔ سچے دل سے یہ مانتے ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وحی اور کلام نازل ہوا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو رسولؐ کی زبان سے جاری ہو رہا ہے اور سچے دل سے یہ مانتے ہوں کہ اگر ہم نے اس کے نافذ کرنے میں ذرّہ برابر

بھی کوتاہی کی تو آخرت میں ہمیں اللہ کے رُوبرو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اگر یہ چیزیں موجود نہیں ہیں تو حدودِ شرعیہ کا اجراء ہو نہیں سکتا۔ ممکن ہی نہیں۔ کوئی ایسا فرد جس کو قانون کی شکل میں حدِ شرعی ملے لیکن وہ اس پر ایمان نہ رکھتا ہو تو وہ پہلی فرصت تلاش کرے گا جس میں اس قانون کو منسوخ کرے اور اپنے لیے نیا قانون بنائے۔ اسی طرح جن لوگوں پر نافذ کیا جاتا ہے اگر ان کے اندر ایمان نہ ہو' وہ یہ نہ مانتے ہوں کہ قرآن برحق ہے اور اسلام کے قانون میں چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہی ہے۔ اگر وہ اس کے اوپر یقین نہ رکھتے ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کسی غریب' چھوٹے اور بے اثر آدمی کے تو ہاتھ کاٹ دیئے جائیں لیکن اگر کسی بااثر آدمی کا ہاتھ کاٹنے کی نوبت آجائے تو بغاوت برپا ہو جائے۔ وہ آبادی اس چیز کو برداشت ہی نہیں کرے گی کہ یہ قانون نافذ ہو۔ اس لیے شریعت سب سے پہلے جس چیز کا تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو نافذ کرنے والے اور جن لوگوں پر اسے نافذ کیا جائے ان کے اندر ایمان ہو' ان کے دلوں میں ایمان ہو۔

(ب) اسلامی اخلاق کا جامع تصور

اس کے بعد دوسری چیز کا شریعت یہ مطالبہ کرتی ہے' کہ اسلام جو اخلاقیات دیتا ہے' بھلے اور برے کا جو امتیاز دیتا ہے' خیرو شر کا جو فرق بتاتا ہے اور جو اقدار انسان کو دیتا ہے کہ یہ چیز قیمتی ہے اور یہ چیز بے قیمت ہے اس کو ٹھیک ٹھیک مان کر سمجھ لیا جائے۔ اگر یہ چیز موجود نہ ہوگی تو مانتے ہوئے بھی وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے کیونکہ ان میں اخلاق موجود نہ ہوگا۔ اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ میں مبتلا لوگ جن کے اخلاق کو گھن کھا چکا ہو ان کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ شریعت کو نافذ کریں۔ اس لیے شریعتِ اسلامیہ ان کے ساتھ اخلاقیات بھی دیتی ہے اور اخلاقیات کا نہایت وسیع تصوّر دیتی ہے جو زندگی کے ہر معاملے سے تعلق رکھتا ہے۔

(ج) شریعت کو پوری زندگی پر نافذ کیا جائے

اس کے بعد تیسری چیز یہ ہے کہ شریعت کا نظام انسانی زندگی کے پورے دائرے پر پھیلتا ہے وہ اس بات سے بھی بحث کرتا ہے کہ پانی میں پاک کیا ہے اور ناپاک کیا ہے' اس شے سے بھی بحث کرتا ہے کہ انسان نجس کس حالت میں ہوتا ہے اور کس حالت میں کس طرح وہ پاک ہو سکتا ہے۔ یعنی شریعت کوئی محدود سا قانونی تصور نہیں رکھتی۔ آپ دیکھیے کہ فقہ کی کتابیں باب طہارت سے شروع ہوتی ہیں اور دنیا کا کوئی قانون آپ کو ایسا نہیں ملے گا جس کے اندر طہارت کے مسئلے سے بحث کی گئی ہو۔ بلکہ حقیقت میں دنیا کی کسی زبان میں طہارت کا ہم معنی لفظ موجود نہیں۔ مغربی ممالک جانتے ہی نہیں کہ طہارت کس چیز کو کہتے ہیں۔ ان کی زبان میں اس کا ہم

معنی لفظ موجود نہیں۔ لیکن اسلامی شریعت طہارت سے بحث کرتی ہے جو کہ ایک فرد کا معاملہ ہے اور افراد کے اندر طہارت پیدا کرتی ہے۔ افراد کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرتی ہے۔ افراد کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے آمادہ کرنا' ان کو بندگی کے طریقے سکھانا یہ شریعت کا کام ہے۔ پھر افراد کو جوڑ کر ایک جماعت بنانا اور اس جماعت کے اندر اسلامی طریقے رائج کرنا' عبادات سے لے کر نکاح کے معاملات تک اور تجارت سے لے کر سیاست اور قانون و عدالت کے معاملات تک' جنگ سے لے کر صلح تک' ملک کی مالیات سے لے کر ملک کی صنعت و حرفت تک ہر چیز کے بارے میں قانون موجود ہے۔ اس چیز کو اگر نافذ کرنا ہے تو آدمی یہ سمجھ لے کہ انسانوں کی پوری زندگی بدل ڈالنا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ صرف ایک پہلو سے ان کی زندگی کو بدلا جائے بلکہ ان کی پوری زندگی کو ہر پہلو سے' افراد سے لے کر جماعت تک' پوری آبادی کو بدلنا ہے' ان کے اندر ایمان داخل کرنا ہے' ان کے اندر اخلاقیات پیدا کرنے ہیں' ان کے اندر آمادگی پیدا کرنی ہے کہ خدا کے قانون کی پابندی کریں اور اس کے بعد تمام معاملات کو اس کے مطابق ڈھالنا ہے۔ مارکیٹ میں جو لین دین ہو رہا ہے' اس کے اوپر بھی شریعت کو نافذ کرنا ہے' بنکوں میں جو مالیاتی لین دین ہو رہا ہے ان کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے۔ یہ انشورنس کمپنیاں جو چل رہی ہیں ان کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے' حکومت جو ٹیکس لگاتی ہے اور ٹیکس لگا کر جس طرح خرچ کرتی ہے ان دونوں چیزوں میں' جو قرض دیتی ہے اور جو قرض لیتی ہے' اور قرض لے کر جس طرح خرچ کرتی ہے' ان سب پر بھی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا ہے' عدالتوں میں بھی شریعت کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ حکومت کے انتظامی شعبوں کو بھی شریعت کے مطابق بدلنا ہے۔ مثلاً اگر پولیس بے ایمان ہے تو اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا' اگر ایک بے ایمان پولیس کے ہاتھ میں اسلامی شریعت دے دی جائے تو وہ پوری آبادی کو نچوا دے گی' تو اس طرح پوری انتظامی پالیسی کو بدلنا ہے۔ اس کی فوج کو بدلنا ہے' اس کی پولیس کو بدلنا ہے' اس کے تمام حکّام اور کارکنوں کو بدلنا ہے' رشوت خور لوگ اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

تو اس طرح سے شریعت کی اس حیثیت کو نگاہ میں رکھیے کہ یہ پوری زندگی کا قانون ہے' کسی ایک پہلو کا نہیں' اور یہ ایمان سے لے کر معاملات کے چھوٹے سے چھوٹے اجزاء تک حتیٰ کہ سڑکوں کی صفائی تک سے بھی بحث کرتی ہے۔ سڑک پر کوئی شخص کانٹے بچھاتا ہے یا لوگوں کو تکلیف دینے والی چیز ڈالتا ہے' کوئی نجاست پھینکتا ہے تو وہ ایک گناہ کرتا ہے۔ ان سارے معاملات پر شریعت حاوی ہے۔ شریعت کے اس حاوی ہونے کے پہلو کو نگاہ میں رکھنے کے بعد

اب دیکھیے کہ اس کے نفاذ کا کیا مطلب ہے۔

③ نفاذِ شریعت کا ہمہ گیر مطلب

اس کے نفاذ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے مدرسوں میں بیٹھ کر شریعت کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے نفاذ کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آپ وعظوں میں اور تقریروں میں اس کو بیان کریں۔ اپنے خطبوں میں اس کو بیان کریں۔ اس کے نفاذ کا مطلب یہ ہے کہ جو احکام شریعت میں ہیں ان کو پوری طاقت سے نافذ کیا جائے۔ جو کام صدر مملکت کا ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ جو وزیراعظم کے کرنے کا کام ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ جو گورنروں اور صوبے کے وزراء کا کام ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کریں۔ جو مالیات کے محکمے کا کام ہے' جو عدالت کے محکمہ کا کام ہے' جو اقتصادیات کے محکموں کا کام ہے۔ جو صحت و تندرستی کے محکموں کا کام ہے وہ سارے کے سارے شریعت کے مطابق چلیں۔ یعنی کوئی ایک چیز نہیں ہے جو درکار ہو بلکہ پوری کی پوری حکومت کا نظام' پورے کا پورا تجارت وصنعت و حرفت و اقتصادیات کا نظام' پورے کا پورا عدالتی اور معاشرتی نظام' سب کچھ اس کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہر چیز میں اس کو نافذ کرنا چاہیے جو چیز کہ محلے کے لوگوں کے نافذ کرنے کی ہے وہ نافذ کریں۔ جو میونسپلٹیوں کے نافذ کرنے کی ہے وہ نافذ کریں۔ جو چیز قانون ساز اسمبلی کے کرنے کی ہے وہ اپنے دائرے میں اسے نافذ کرے۔ پوری کی پوری گورنمنٹ اس کے مطابق ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ کوئی شیخ الاسلام بنا کر بٹھا دیا جائے یا وزارتِ مذہبی امور بنا دی جائے اور سمجھ لیا جائے کہ شریعت کا نفاذ ہو گیا۔ یہ کوئی بات نہیں' پورے کے پورے نظامِ حکومت کو تبدیل کرنا اور اسلام کے مطابق چلانا ہے' اس کا نام ہے نفاذِ شریعت' میں مختصر عرض کر رہا ہوں ورنہ اس کی تفصیل زیادہ ہے۔

اب دیکھیے کہ پاکستان میں اس کا نفاذ کیسے ہو سکتا ہے۔

④ پاکستان میں نفاذِ شریعت کیوں نہیں ہوا؟

پاکستان میں اس کے نفاذ میں اختلاف کیوں پیدا ہوا؟ ویسے تو ہم ایک مسلمان قوم ہیں' اور پاکستان اسلام کا نام لے کر بنایا گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا اور فطرتاً آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہ آپ سے آپ ہونا چاہیے تھا کہ جس روز پاکستان بنا تھا' شریعتِ اسلامی اسی روز نافذ ہو جاتی۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوا' اسکی کچھ وجوہ ہیں:

(۱) کافرانہ حکومت کے اثرات

ایک وجہ یہ ہے کہ ایک مدت دراز تک یہاں کفر کی حکومت مسلّط رہی ہے۔ اس نے تعلیم کا نظام ایسا بنایا کہ اس نے لوگوں کے ذہن بدل کر رکھ دیئے' سوچنے کے انداز بدل دیئے' اپنی تعلیم کے اثر سے لوگوں کو اس حد تک بہکایا کہ قلیل تعداد تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی رہ گئی جو واقعی دل میں ایمان رکھتی ہو اور سچے دل سے مانتے ہوں کہ اللہ کے رسولؐ جو کچھ لائے وہ برحق ہے ورنہ ایک کثیر تعداد ایسی ہو گئی جو اس بات کی قائل ہی نہیں تھی کہ وحی آسکتی ہے' جو اس بات کی قائل ہی نہیں رہی تھی کہ نبوّت بھی کسی چیز کا نام ہے جو سمجھتے تھے کہ نبوّت اور وحی افسانے ہیں۔ ان کے نزدیک جو کچھ یورپ اور امریکہ سے آتا ہے وہ برحق ہے' اس کے بارے میں کوئی سوال کرنے کی حاجت نہیں' جیسا وہ آرہا ہے جوں کا توں مان لیں گے۔ اس میں کوئی چیز شک کی اور دریافت طلب بات نہیں۔ اور وہ کتاب جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لاریب فیہ اس میں ہر ریب کی گنجائش ہے۔ تو یہ تو تعلیم کے اثرات تھے۔ ان میں جن لوگوں نے اپنا ایمان کچھ بچایا' ان کی فکر اسلامی نہیں تھی۔ سوچنے کا انداز اسلامی نہیں تھا۔ جنھوں نے سوچنے کا انداز اسلامی بنانے کی کوشش کی ان کے پاس علم اسلامی نہیں تھا۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ اسلام کیا ہے' اس کے احکام کیا ہیں۔ کس قسم کا نظام وہ چاہتا ہے' جس وقت ہم نے یہ نام لینا شروع کیا کہ اسلامی نظام حکومت قائم ہونا چاہیے تو لوگ پوچھتے تھے کہ اسلامی نظامِ حکومت سے کیا مراد ہے۔ عام لوگ ہی نہیں بعض دفعہ علماء کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل ہوتا تھا۔ بعض لوگوں نے یہاں تک ہم سے کہا کہ یہاں کس چیز کی باتیں کر رہے ہو یہ اس زمانے میں چلنے والی چیز نہیں اور میں نے ان سے عرض کیا کہ حضور اگر یہ چلنے والی چیز نہیں تو اس پر ایمان کیوں رکھتے ہو۔ پھر جو چلنے والی چیز ہے اس پر ایمان لائیے۔ میری بعض علماء سے بات چیت ہوئی انھوں نے مجھ سے یہ بات کہی اور میں نے ان سے یہی عرض کیا۔

ایک اچھا خاصا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر شیخ الاسلامی قائم ہو جائے اور قضائے شرعی کا انتظام ہو جائے تو بس اسلام کا نفاذ ہو جائے گا۔ یہ جب ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کے خیالات تھے تو آپ اندازہ لگایئے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ ان کے اندر ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہ کہتے تھے کہ اگر ہم اسلامی نظام یہاں نافذ کریں تو ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے کہ یہ چودہ سو برس پہلے کا قانون یہاں نافذ کر رہے ہیں۔ یہ ہم نے خود باتیں سنی ہیں جب ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔ بس

اس چیز کا اس وجہ سے ذکر کر رہا ہوں کہ آپ کو وہ رکاوٹیں سمجھ میں آجائیں۔

(ب) اسلام نا آشنا قیادت

باوجود اس کے کہ یہ ایک مسلمان قوم تھی اور اس نے اسلام کا نام لے کر پاکستان قائم کیا تھا۔ لیکن وہ اسلام کا نظام نافذ نہیں کر سکی۔ کیوں نہیں کر سکی؟ اس لئے کہ اس کے جو کار فرما لوگ تھے' جن کے ہاتھ میں نظام تھا ان کی تربیت اور تعلیم کسی اور طرز پر ہوئی تھی' وہ جانتے ہی نہ تھے کہ اسلام کیا ہے' ان کا سوچنے کا انداز بھی اسلامی نہ تھا اور ان کے اندر خواہش بھی اسلامی نظام کو نافذ کرنے کی نہیں تھی۔ نہ اس کو جانتے تھے کہ کیا چیز ہے نہ اس کو مانتے تھے کہ وہ برحق ہے اور نہ وہ یہ ارادہ رکھتے تھے کہ اس کو نافذ کرنا چاہئے۔ ظاہر بات ہے یہ پھر کیسے نافذ ہو سکتا تھا۔

(ج) کافرانہ قوانین کے اجرا کا نتیجہ

جہاں تک عام آبادی کا تعلق تھا اور ہے اس کے اندر اسلام کے ساتھ عقیدت موجود ہے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے اندر ایمان بھی مجمل طور پر موجود ہے۔ چاہے وہ ایمان کی تفصیلات نہ جانتے ہوں لیکن مجمل طور پر ایمان ان میں ہے۔ وہ خدا کو مانتے ہیں۔ رسولؐ کو مانتے ہیں بلکہ رسولؐ کے نام پر جان دینے کو تیار ہیں۔ قرآن کو برحق مانتے ہیں اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کا احترام کرتے ہیں۔ آخرت کے منکر نہیں۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ لیکن کفار کی ایک طویل مدت کی حکومت اور کافرانہ قوانین کے اجراء نے اور ان کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دینے نے اس مدت دراز کے اندر لوگوں کی عادات اور خصائل بدل ڈالے' مسلمان جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے لیکن اس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہی چیز اس پر مسلط ہے۔ ہر طرف سے وہ اس پر محیط ہے مثلاً سود' کون مسلمان نہیں جانتا کہ سود حرام ہے۔ مگر جب سود ہی پر سارا نظام قائم ہو جائے' تجارت کا' صنعت و حرفت کا اور مالیات کا تو کون آدمی اس سے بچے' اس میں مبتلا ہوتے وقت مسلمان کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کس طرح اسے بھی حلال کر دیا جائے کیونکہ حرام کو حرام جانتے ہوئے اس کو کرنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ تو کر نہیں سکتا کہ حرام سے اجتناب کرنے' چاہتا یہ ہے کہ کسی طرح حرام کو حلال کر دیا جائے' اب تک میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں جو اس طرح کے سوالات کرتے ہیں اور میں ان سے کہتا ہوں کہ بھائی حرام کو حلال کرنے کے اختیارات مجھے حاصل نہیں۔ کیسے آپ کے لیے حلال قرار

دوں۔

لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کافرانہ نظام کے تسلط کی بدولت لوگوں کے سوچنے کے انداز ہی نہیں بدلتے‘ عادات بھی بدل جاتی ہیں اور ان کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ نظام اسلامی کو برحق ماننے کے باوجود اس چیز سے پرہیز کریں۔

اب اس کے بعد جب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی حکومت آئی جو نہ اسلام کو جانتے تھے نہ اسلام کو نافذ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے نہ اسلام کو نافذ کرنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ تو ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر ہم اس بات کو پھیلنے دیں کہ ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو اور عام لوگوں کے اندر اس بات کی طلب پیدا ہو جائے تو پھر ہمارا چراغ کہاں جلے گا؟ لوگ ہماری طرف کیسے توجہ کریں گے؟ پھر اس کی تلاش ہو گی جو اس کو نافذ کر سکے۔ اس لیے انہوں نے ستائیس سال اس کام پر صرف کیے کہ قوم کے مزاج کو بدلا جائے۔ ان کے اخلاق کو بدلا جائے۔ ان کے اندر برائیوں کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ گانے اور ناچ کا رسیا بنایا جائے۔ اس کے اندر جہاں تک ہو سکے شراب خوری پھیلائی جائے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ سود میں مبتلا کیا جائے‘ اتنے سود میں جتنا انگریز کے زمانے میں بھی نہیں تھا۔ اس میں مخلوط تعلیم رائج کی جائے تاکہ عورتوں اور مردوں کے میل جول سے جو کچھ تہذیب و تمدن کا ستیاناس ہوتا ہے اور ہو رہا ہے وہ اور پیدا ہو‘ غرض انہوں نے ہر ممکن طریقے سے پوری قوم کو بگاڑ دینے کا پروگرام بنایا جس پر برابر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ نفاذِ شریعت کے لیے جس قسم کا ماحول چاہیے اس نوعیت کا ماحول بنانے کی بجائے اس کے برعکس نوعیت کا ماحول ستائیس برس میں بنایا گیا۔

⑤ پاکستان میں شریعت کا نفاذ کیسے ہو گا؟

① دلوں میں ایمان اتارنا ہو گا

اب جب آپ یہ سوچنے کے لیے بیٹھیں گے کہ ہم یہاں نفاذِ شریعت کیسے کریں۔ تو آپ کو ایک طرف لوگوں کے دلوں میں ایمان اتارنا پڑے گا۔ کیونکہ ایمان کے بغیر وہ بنیاد ہی قائم نہیں ہو سکتی جس پر نظام شریعت کا نفاذ ہو سکے۔ وہ عمارت ہی نہیں کھڑی ہو سکتی۔ اس لیے پہلے ایمان

اتارنا پڑے گا۔ تمام شکوک و شبہات کے کانٹے جو ان کے اندر چبھے ہوئے ہیں وہ نکالنے پڑیں گے۔ ان کو مطمئن کرنا پڑے گا' پڑھے لکھوں کو بھی اور عوام کو بھی' جتنا کچھ عوام کے لیے درکار ہے اتنا کچھ عوام کے لیے اور جتنا پڑھے لکھوں کے لئے درکار ہے اتنا کچھ پڑھے لکھوں کے لیے کرنا پڑے گا۔

(ب) اصلاحِ اخلاق کرنی ہوگی

اس کے بعد آپ کو ان کے اخلاق کی طرف توجہ کرنی پڑے گی کیونکہ ایک بداخلاق قوم کبھی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ اسلامی نظام نافذ کرسکے۔ تو اخلاق کی فکر کرنی پڑے گی۔

(ج) اسلامی نظام کے لیے تڑپ پیدا کرنی ہوگی

اس کے بعد آپ کو عام لوگوں کے اندر یہ تڑپ پیدا کرنی پڑے گی کہ وہ یہ سمجھیں کہ جب تک اسلام کا نظام جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں نافذ نہیں ہوتا اس وقت تک ہمارے لیے کوئی زندگی نہیں۔ اس کے بغیر آپ اس کو نافذ نہیں کرسکتے۔ اگر لوگ قائل ہوں کہ فی الواقع اسلام کا نظام آنا چاہیئے اور وہ اس بات کے خواہش مند بھی ہوں کہ یہ نافذ ہو لیکن اس کی تڑپ موجود نہ ہو' اس کے لیے لگن موجود نہ ہو اور یہ ارادہ موجود نہ ہو کہ دوسرے نظام کو ہم نہیں چلنے دیں گے اگر ہمارے اوپر نافذ ہو گا۔ اس وقت تک قوم اس کے لیے تیار نہیں ہو سکتی کہ ایک غلط غیراسلامی نظام چل رہا ہے۔ وہ مجبور ہو جائے جگہ چھوڑنے کے لیے اور اس کی جگہ اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔

(د) نفاذِ شریعت کا کام پھولوں کی سیج نہیں

یہ کھیل نہیں ہے' یہ زبان سے کہنے کے لیے بہت آسان کام ہے لیکن یہ ایسا کام ہے کہ اس راہ میں ہر قدم انسان کے لیے مصیبتوں' اذیتوں' تکلیفوں اور نقصانات سے بھرا پڑا ہے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے آئے تھے تو جن لوگوں نے اس کو قبول کیا تھا ان پر کیا گذری تھی اور جس شخص نے اسے پیش کیا تھا اس کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا۔ اگر اس بھٹی سے نہ گزرتے تو اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت بھی لوگ اس بھٹی سے گزرے تھے اور گزرنے کے بعد جن لوگوں نے قدم قدم پر چوٹیں کھائی تھیں اور قدم قدم پر تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ قدم قدم پر نقصانات اٹھائے تھے۔ گھربار

چھوڑے تھے۔ آگ کے انگاروں پر لٹائے گئے تھے۔ تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر پتھر ان پر رکھ دیئے گئے تھے' الٹا لٹکا کر ان کو بوری میں لپیٹ کر آگ کی دُھونی دی گئی تھی۔ جب تک ان سارے راستوں سے گزر نہ گئے' اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں اقتدار نہیں دیا۔

ان راستوں سے گزرنے کے بعد بھی بدر و احد کے دنوں کو یاد کر لیجئے۔ اور حنین کا معرکہ بھی یاد کر لیجئے۔ ایسے تمام حالات میں اپنے سے کئی کئی گنا زبردست طاقتوں کے مقابلے میں آدمی کھڑا ہو اور ہر مصیبت اور ہر مشکل و تکلیف کو برداشت کرے اور کوئی پروا نہ کرے کہ مقابلے میں کتنی بڑی طاقت ہے۔ کوئی پروا نہ کرے کہ کتنی زیادہ چوٹ مجھے لگتی ہے۔ کتنا میں قید کیا جاتا ہوں اور کتنی مجھے اذیت دی جاتی ہے۔ اور کیسے کیسے زبردست دشمنوں سے مجھے سابقہ ہے۔ کس آگ کے گڑھے کی طرف لے جایا جا رہا ہوں۔ اس سب کچھ کی پروا کیے بغیر جو لوگ آگے بڑھیں گے وہ یہاں نظامِ شریعت نافذ کر سکتے ہیں اور باطل پر قابو پا سکتے ہیں۔

(ر) جدید تعلیمی درسگاہوں میں کام کی ضرورت

یہ چیز جب آپ کریں گے تو اس کے اثرات آہستہ آہستہ پھیلیں گے۔ اس کے اثرات کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی جائیں گے۔ اور انہی درسگاہوں میں جو کافر بنانیوالی ہیں اس ذہن کی نسل تیار ہوگی۔ انہی میں وہ نوجوان تیار ہوں گے جو اسلامی نظام چاہتے بھی ہونگے اور وہ علم بھی حاصل کریں گے کہ اسلامی نظام کیسے نافذ ہو اور اس کے لیے جب وہ منظم ہو کر کام کریں گے تو ان کے مقابلے پر ہر حربہ استعمال کیا جائے گا کہ کسی طرح دب جائیں۔ ان کے اوپر گولیوں کی بھی بوچھاڑ ہوگی۔ ان کے اوپر لاٹھیوں کی بھی بوچھاڑ ہوگی۔ ان کو جیلوں میں بھی ٹھونسا جائے گا۔ ان کو اذیتیں بھی دی جائیں گی۔ مگر جب تک وہ اس بھٹی سے نہیں گذریں گے وہ کھرا سونا نہیں بن سکتے جو اس بھٹی سے گزر کر بنتا ہے۔

(س) ملازمین میں اسلامی ذہنیت پیدا کرنے کی ضرورت

اسی طرح سرکاری ملازمین کے اندر بھی ان خیالات کو بڑے پیمانے پر پھیلنا چاہیئے کہ وہ کسی ظلم کے آلۂ کار بننے کیلئے تیار نہ ہوں۔ ان کے ہاتھوں سے غلط کام نہ کروایا جا سکے' وہ اس بات کے لیے تیار ہو جائیں کہ نوکری چھوٹ جائے' وہ تیار ہو جائیں کہ ان کے بیوی بچے فاقہ کریں گے لیکن اس کے لیے تیار نہ ہوں کہ غلط کام اپنے ہاتھوں سے کریں۔ یہ ذہنیت سرکاری ملازمین میں بھی پیدا ہونی ضروری ہے' تب حکومت محسوس کرے گی کہ اب ہمارا کام نہیں چل سکتا جب

تک ہم اسلامی شریعت کے لیے تیار نہ ہوں۔ اور اگر ہم تیار نہ ہوں تو پھر ان لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دیں جو اس کو نافذ کر سکیں۔

(ص) رائے عامہ کو اسلام کے حق میں بدلنے کی ضرورت

اسی طرح یہاں جمہوری نظام چل رہا ہے تو انتخابات میں کوشش کی جاتی ہے کہ عوام کو جس طرح بھی ہو سکے دھوکا دے کر، فریب دے کر، طرح طرح کے وعدے کر کے ان کی رائے حاصل کر لی جائے اور دنیا کو یہ دکھایا جائے کہ ہم عوام کی رائے سے آئے ہیں۔ آپ کو عوام کی رائے اتنی بدلنی پڑے گی کہ اس طرح کے لوگ عوام کا ووٹ حاصل نہ کر سکیں۔ عوام کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ہمارا جینا حرام ہے اگر ہم یہاں اسلامی نظام نافذ نہ کریں۔ عوام یہ سوچ ہی نہ سکیں کہ ہم کسی ایسے شخص کو بھی ووٹ دے سکتے ہیں جس کی اپنی زندگی میں اسلامی نظام کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی ہے۔ جس کا عمل اسلامی نہیں ہے۔ جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتا ہے مگر اسلام نہیں جانتا ہے۔ ایسے کسی شخص کے لیے کوئی ووٹ نہ ہو، یہ حالت آپ کو پیدا کرنی ہوگی۔

(ط) عزم کے مقابلے میں کوئی دھاندلی کامیاب نہیں ہو سکتی

اگر اس حالت میں انتخابات ہوں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ منصفانہ انتخابات ہوں تو بہت اچھا، ہم نہیں چاہتے کہ ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالا جائے۔ اگر گھی ٹیڑھی انگلی کے بغیر نکل سکتا ہے تو کوئی احمق ہی ہو گا جو خواہ مخواہ انگلی ٹیڑھی کرے۔ لیکن اگر قوم کے اندر یہ عزم پیدا ہو جائے کہ ہمیں اس نظام کو یہاں نافذ کرنا ہے تو پھر کوئی دھن، دھونس، دھاندلی اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔

> لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ آپ کو جان مار کر مدت دراز تک کام کرنا پڑے گا یہاں تک کہ وہ مرحلہ آجائے جس میں ذرا سی عقل رکھنے والے لوگ بھی از خود جگہ خالی کر دیتے ہیں خود ہٹ جاتے ہیں۔ وہ مرحلہ جب آجاتا ہے تو ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب ہمارا چراغ اس قوم میں نہیں جل سکتا۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر نہ ہٹیں تو ان کو ہٹانا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا بشرطیکہ قوم کے اندر پورا عزم پایا جائے۔

میں نے ایک عام تصور آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کہ شریعت اسلامی کیا ہے اور یہ بھی

آپ کے سامنے واضح ہوگیا ہے کہ اس کے نفاذ کے کیا معنی ہیں اور یہ بھی آپ کے سامنے آگیا ہے کہ اس کو نافذ کرنے کا راستہ کیا ہے۔ اب یہ ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا یہاں اس کا امکان ہے؟

۹ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے امکانات

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ امکان کے سوال کے دو جواب ہیں:

تدبّر و قربانی سے یہ کام ممکن ہے

ایک جواب یہ ہے کہ انسان پیہم اور مسلسل سعی کرے اور سوچ سمجھ کر سعی کرے' بیوقوفوں کی طرح نہیں' سوچ کر عقلمندی کے ساتھ' تو وہ بڑے سے بڑے پہاڑوں کے اندر سرنگ پیدا کر سکتا ہے۔ وہ سمندروں کے نیچے سے سرنگ نکال سکتا ہے' سمندروں کے اندر سے تیل نکال سکتا ہے' وہ چاند کے اوپر پہنچ سکتا ہے۔ جب انسان یہ کچھ کر سکتا ہے تو انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم طاقتیں دی ہیں کہ اگر وہ اللہ کا نظام نافذ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس کو بھی نافذ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے جان لڑانی ہے' محنت کرنی ہے' عقل مندی کے ساتھ کام کرنا ہے اور مسلسل جان کھپانی ہے' اور اس کام کو وہ لوگ کر سکتے ہیں جو یہ شرط نہ لگائیں کہ ہم اس کو اپنے سامنے نافذ ہوتے دیکھیں اس لیے کہ نہ معلوم کتنوں کو اس کے نفاذ کی کوشش میں پہلے ہی جان دینی پڑے۔ بدر میں جن لوگوں نے شہادت پائی اگر وہ جان نہ دیتے اور یہ کہتے کہ ہمیں تو اس وقت کے لیے زندہ رہنا ہے جب اس نظام کو نافذ ہوتے دیکھیں گے' دنیا پر غالب ہوتے دیکھیں گے تو دنیا پر اسلام غالب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ غالب ہوا اس طرح کہ بکثرت لوگ اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے اس بات کی فکر نہیں کی کہ یہ نافذ ہو سکے گا یا نہیں۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ ہمارا فرض ہے ہمیں اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنی ہے جس کے نتیجے میں شہادت آتی ہے تو اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں' اس نظریئے کے ساتھ' اس سوچ کے ساتھ وہ آئے اور انھوں نے آکر کام کیا اور ان کی قربانیوں کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی قبول کرنے والا تھا' وہ قبول ہو گئیں' لیکن جو جان لڑانے والے تھے اور بچ رہے' اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے ایسا دین غالب کیا کہ دنیا کے بڑے حصے پر چھا گیا تو امکان یہ بھی ہے۔

اگر یہ جدّوجہد کے باوجود نافذ نہیں ہوتا تو یہ قوم کی حرماں نصیبی ہے

اور امکان اس اَمر کا بھی ہے کہ آپ تمام عمر جدوجہد کریں اور پھر یہ نظام نافذ نہ ہو' اور

اس کی وجہ اس نظام کی کمزوری نہیں ہوگی' اگر آپ اس نظام کے لیے سعی کرنے کا حق ادا کریں تو آپ کی بھی کمزوری نہیں ہوگی' تو وہ قوم کی بدبختی ہوگی جو ایسے لوگوں کا ساتھ نہ دے' اللہ تعالیٰ کسی قوم کو وہ چیز نہیں دیتا جس کا وہ اپنے آپ کو اہل ثابت نہیں کرتی' یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ قوم اپنے آپ کو فساق و فجار کے لیے تیار کرے اور اس پر راضی ہو جائے اور چاہے کہ فسّاق و فجّار ہی ان کے اوپر معاملات چلانے والے ہوں تو اللہ تعالیٰ زبردستی ان کو صالحین اور متقی نہیں دیں گے۔ یہ نہیں ہوتا تو وہ لوگ جنھوں نے ایسی قوموں میں کام کیا اور اپنی عمریں ان کے اندر کھپا دیں اور ان کی قوم سیدھے راستے پر نہ آئی تو وہ ناکام نہیں تھے۔ وہ قوم ناکام تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے قصے میں آتا ہے کہ جس وقت فرشتے قوم لوط پر عذاب دینے کے لئے بھیجے گئے تو انہوں نے کہا مَاوَجَدْنَا فِیْھَا غَیْرَبَیْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ------ پوری قوم میں ایک مسلم گھر تھا اس کے لوگوں سے کہا' نکل جاؤ اور حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ بیوی کو چھوڑ جاؤ۔ یہ عذاب میں پکڑی جائے گی یعنی اس گھر میں بھی کافرہ موجود تھی اور وہ بھی پورے کا پورا مومن نہیں تھا' ان کو چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد جو عذاب لایا گیا وہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں واضح ہے تو ایک قوم نہ چاہتی ہو کہ ان کے اوپر اسلامی نظام نافذ ہو۔ ایک قوم اگر نہ چاہتی ہو کہ اس کے معاملات ایماندار اور خدا ترس لوگ چلائیں۔ ایک قوم خود بددیانت اور بے ایمان کو چاہتی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو زبردستی نیک لوگ نہیں دیتا۔ ان نیک لوگوں کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ وہ ناکام نہیں ہیں۔ اگر ان کی بات نہ چلے تو وہ ناکام نہیں ہیں ناکام وہ قوم ہے۔

امکان کو نگاہ میں رکھ کر کام نہ کریں

اس پہلو کو نگاہ میں رکھ کر کام کیجئے' اور یہ سمجھ کر نہ کیجئے کہ اس کا امکان ہو تو ہم کریں۔ یہ سوال جو لوگ کرتے ہیں کہ کیا امکان ہے تو ان سے میں پوچھتا ہوں کہ بھائی فرض کرو کہ اس کا امکان نہیں ہے تو کیا آپ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جس چیز کا امکان ہے اس کے لیے کام کریں یہ تو پھر مومن کا کام نہیں ہے۔

مومن کا کام تو یہ ہے کہ اگر اس کے نافذ ہونے کا ایک فیصد امکان نہ ہو بلکہ ایک فی ہزار بھی امکان نہ ہو تب بھی وہ اس کے لیے جان لڑائے اس راستے میں کوشش کرتے ہوئے جان دے دینا کامیابی ہے اور کسی غلط راستے پر جا کر وزیراعظم یا صدر اعظم بن جانا بھی کامیابی نہیں' کھلی ناکامی ہے۔

آپ دیکھیں کہ آپ کا فرض کیا ہے

تو اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ امکان کی شرط کے ساتھ آپ کو یہ کام نہیں کرنا بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کرنا ہے کہ یہ ہمارے کرنے کا کام ہے اور اس کے سوا ہمارے کرنے کا کوئی کام نہیں۔ مثلاً اگر ایک آدمی کے سامنے یہ سوال آئے کہ پیشاب بھی پینے کی چیز ہے تو جو آدمی طہارت کی ذرہ برابر بھی حس رکھتا ہو تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ بھی کوئی پینے کے قابل چیز ہے۔ وہ برابر اسی تلاش میں رہے گا کہ اسے پینے کے لیے صاف پانی ملے لیکن کبھی اس کا ذہن اس طرف نہیں جائے گا کہ پیشاب بھی کوئی پینے کے قابل چیز ہے۔ اسی طرح وہ آدمی جو اسلام کا سچے دل سے قائل ہے وہ یہ سوچ نہیں سکتا کہ دوسرے جن راستوں میں آسانیاں ہیں' جن راستوں میں سہولتیں ہیں' عیش ہے' لذتیں ہیں' فائدے ہیں ان کی طرف جائے کہ ان کا امکان ہے اور اسلام کا کوئی امکان نہیں' اس کے سوچنے کے قابل بھی وہ چیز نہیں' وہ کبھی حسرت بھری نگاہ بھی نہیں ڈالے گا ان کے محلات پر' ان کی کوٹھیوں پر' ان چیزوں پر' وہ کبھی یہ نہیں سوچے گا کہ کاش یہ دولت میرے پاس آئے۔ اس وجہ سے صرف وہ لوگ اس کام کو کر سکتے ہیں جو 'امکان ہے' کو چھوڑ کر یہ دیکھیں کہ ہمارا فرض کیا ہے۔ اور اس فرض کو ادا کرنے کے لیے ہر تکلیف' ہر مصیبت اور ہر مشکل برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں' یہی ان کے کرنے کا کام ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگ پیدا کر دیئے اور انہوں نے پوری ہمت کے ساتھ اس کے لیے کام کیا تو میں یہ نہیں سمجھتا کہ کونسی طاقت یہاں ایسی ہے جو انہیں آگے بڑھنے سے روک سکے۔ اللہ نے چاہا تو اس میں کامیابی ہی ہوگی۔

میں نے دوسرا پہلو آپ کے سامنے پیش کیا وہ اس لیے کہ کامیابی کی شرط کے ساتھ آپ کام نہ کریں۔ میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس ملک کے اندر ایک مٹھی بھر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو پوری تنظیم کے ساتھ' پورے ڈسپلن کے ساتھ' عقل و ہوش کے ساتھ اور دیوانگی کے ساتھ' دونوں چیزیں ساتھ چاہئیں' یہ کام کریں اس میں جان لڑائیں اور مسلسل جان لڑاتے جائیں اور ہر تکلیف اور خطرے کو انگیز کرنے کیلئے تیار ہوں تو وہ لوگ جو اس وقت ایک غیر اسلامی نظام کو چلاتے ہیں وہ ایسی طاقت نہیں رکھتے کہ ان کے سامنے ٹھہر سکیں۔

نظام باطل کھوکھلا ہوتا ہے

دفعہ یہ ہے کہ آپ اس بات کو دیکھئے کہ جو لوگ اس نظام کو چلا رہے ہیں ان کی حالت کیا

ہے۔ ان میں سے کوئی دو آدمی ایک دوسرے سے مخلص نہیں ہیں۔ ان کی دوستیاں بے غرضی پر مبنی نہیں' بے لوثی پر مبنی نہیں' قلبی محبت پر مبنی نہیں' مفاد پر مبنی ہیں' جس کے ساتھ ہیں اس کا ساتھ بھی دے رہے ہیں اور دل میں گالیاں بھی دے رہے ہیں' بلکہ وہ اپنی پرائیویٹ مجلسوں میں جب دیکھتے ہیں کہ بات نہیں پہنچے گی تو وہ ان مجلسوں میں بھی کھلم کھلا کہتے ہیں۔ باطل نظام بظاہر بڑے زور کے ساتھ نافذ ہوتا ہے لیکن اصل میں کھوکھلا ہوتا ہے ٹھوس نہیں ہوتا۔ اس میں قائم رہنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے کہ ایسے لوگوں کو موقع دیا جائے تو ایسے لوگوں کو موقع ملتا ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے عقل مندی کرکے وہ تمام راستے بند کر دیئے ہیں جن سے خطرہ آسکتا ہے' لیکن ایک راستہ اللہ تعالیٰ نے ایسا رکھ چھوڑا ہے جدھر سے اس کو خطرہ لاناہوتا ہے وہ اس راستے کو بند نہیں کرسکتے۔ اس طرح سے ایسے نظام قائم ہوتے ہیں وہ بار بار جمتے اور اکھڑتے ہیں۔ اور لوگ اس انتظار میں ہیں کہ کوئی ایسا گروہ آئے جو ایک مضبوط بنیاد پر ان کے لیے ایک نظامِ حق قائم کرے۔ جب تک ایسا گروہ سامنے نہیں آئے گا اور اس مرحلے تک نہیں پہنچ جائے گا کہ وہ نظام حق کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرسکے اس وقت تک یہاں کھوکھلے نظام قائم ہوتے اور بدلتے رہیں گے۔ آدمی بدلیں گے وہ کھوکھلا نظام جوں کا توں رہے گا صرف اشخاص بدلتے چلے جائیں گے۔

حالات اہلِ حق کے منتظر ہیں

آپ دیکھیے یہاں جو نظام ۲۷ سال سے آرہا ہے اس میں صرف اشخاص بدلتے گئے' قسم ایک ہی رہی ہے' نظام کی نوعیت ایک ہی رہی ہے' اس کی فطرت ایک ہی رہی ہے' یہی صورتحال جاری رہے گی اس انتظار میں کہ کب وہ لوگ آتے ہیں۔ اگر وہ لوگ نہ آئے تو نہیں معلوم اس قوم کا کیا حشر ہوگا کہ یہ مسلسل انقلابات کو برداشت بھی کرسکے گی یا نہیں۔ اور یہ مسلسل انقلابات کے لیے زندہ بھی رہ سکے گی۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس قوم کو کوئی بھی چیز بچا سکتی ہے تو یہی نظامِ حق ہے' وہ یہاں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔ قبل اس کے کہ خدا کا عذاب فیصلہ کردے کہ اس قوم کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

جمعیت اتحاد العلماء کے زیرِ اہتمام راولپنڈی میں منعقدہ نفاذ شریعت کانفرنس سے مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا ایک اہم خطاب جسے ہفت روزہ "ایشیا" نے اپنی اشاعت ۱۴ مارچ ۷۶ء میں شائع کیا۔ (س کاشمیری)۔

خصوصی تجزیہ

نفاذِ شریعت ایکٹ ۹۱ء پر اعتراضات کا

---- ایک علمی محاکمہ ----

پروفیسر خورشید احمد

قسط (۱)

پارلیمنٹ میں "نفاذِ شریعت بل" پیش ہوتے ہی ملک میں بحث کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا' جو اس کے ایکٹ بن جانے کے بعد بھی جاری ہے ۔ یہ سلسلہ کوئی نیا سلسلہ نہیں ۔ جب بھی نفاذ شریعت کا مطالبہ ہوا ہے ' یا اس کا امکان پیدا ہوا ہے ' یا اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھایا گیا ہے ' اسی طرح بحث کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے ۔ اور نہ آج کوئی ایسی نئی بات کہی جا رہی ہے ' جو پہلے نہ کہی گئی ہو ۔

اس بحث میں شریک ہونے والے ----- کچھ وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ نفاذ شریعت ایکٹ کے قانون بنتے ہی نفاذِ شریعت کا وہ وعدہ پورا ہوگیا جو قیامِ پاکستان کے وقت کیا گیا تھا ' اور جس کا اعادہ پورے زور شور سے ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے دوران کیا گیا تھا ۔ اور اس طرح قوم کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونا شروع ہوگیا ہے ۔ یہ طبقہ اربابِ اقتدار کا ترجمان ہے اور اس وقت اس سے تعرّض کرنا ہمارے پیشِ نظر نہیں ------ کچھ اور لوگوں کے نزدیک اس ایکٹ سے نفاذِ شریعت کے عمل میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی ہے ' نہ ہوگی ۔ ان کے نزدیک یہ اقدام ناکافی ' غیر تسلی بخش اور ناقابلِ اعتبار ہے ۔ جس طرح اور جس انداز میں یہ ایکٹ پاس ہوا ہے ' اس کی روشنی میں ان کے احساس کو بے وزن کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا ----- تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو سرے سے نفاذ شریعت چاہتے ہی نہیں ' یا اس کے مخالف ہیں ۔ وہ شریعت بل کی مخالفت کی آڑ میں دراصل شریعت کے نفاذ اور معاشرہ و ریاست میں قرآن و سنت کی بالا دستی کی مخالفت کرتے ہیں ۔ کہیں تھیوکریسی ' کہیں ملّا کریسی ' کہیں دستور ' پارلیمنٹ کی بالا دستی اور بنیادی حقوق ' کہیں عدالتوں کے حق کے چھین لیے جانے کی دھائی دے کر ' اور ان کے ختم ہوجانے کے موہوم اور بے بنیاد اعتراضات کی آڑ میں وہ انتہائی چابکدستی سے ایک ناواقف آدمی کے ذہن کو مسموم کرنے میں لگے ہوئے ہیں ۔

اس تیسرے گروہ کی طرف سے جو بحث ملک میں پچھلے چند مہینوں میں ہوئی ہے اور جو باتیں

خود پارلیمنٹ میں کہی گئی ہیں (بشمول اس اختلافی نوٹ کے جو اسمبلی کے چند ارکان نے سلیکٹ کمیٹی (Select Committee) کی رپورٹ کے ساتھ پیش کیا) وہ اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ اس ایکٹ اور اس کے بارے میں کہی جانے والی ان کی باتوں کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے تاکہ صرف ایکٹ ہی نہیں بلکہ خود نفاذِ شریعت کے بارے میں ملک میں جو سوال اٹھائے گئے ہیں اور جو بحثیں برپا کی گئی ہیں ان کا محاکمہ کیا جاسکے ' اور جہاں کہیں کچھ حقیقی غلط فہمیاں یا اُلجھنیں پائی جاتی ہیں ان کو دور کیا جاسکے ۔ دراصل شریعت بل کی آڑ میں لادینی لابی (Secular Lobby) خود شریعت کو ہدف بنا رہی ہے اور اسلام کے مقابلہ میں لادینیت (Secularism) اور لبرل ازم (Liberalism) میں ملک کے سیاسی مستقبل کو تلاش کر رہی ہے ۔ ضروری ہے کہ اس شرانگیز کوشش کا پردہ چاک کیا جائے ۔ نیز اسلام اور اس کے قانون کے بارے میں جو غلط بیانیاں اور شرانگیزیاں (INSINUATION) کی جا رہی ہیں ان کا مثبت جواب دیا جائے ۔

○

جب بھی شریعت حقیقتاً نافذ ہوگی ' اسے ملک کے اعلیٰ ترین قانون کی حیثیت لازماً حاصل ہوگی ۔ اس کے علی الرغم کہ دستور میں لکھے بغیر یہ بات کتنی مؤثر ہوگی ' موجودہ شریعت ایکٹ کا سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ اس میں شریعت کو "پاکستان کا اعلیٰ ترین قانون " (Supreme Law of Pakistan) تسلیم کیا گیا ہے ۔

پاکستان کے دستور ۱۹۷۳ء میں اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے (دفعہ ۲)۔ پھر ۱۹۸۵ء میں قراردادِ مقاصد (objectives Resolution) کو دستور کا قابلِ تنفیذ (Operative) حصہ قرار دیا گیا ہے (دفعہ ۲ ۔ الف) ۔ پارلیمنٹ کو پابند کیا گیا ہے کہ ملک میں کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے احکام کے خلاف نہیں ہوسکتی ۔ نیز یہ کہ تمام مروّجہ قوانین کو قرآن و سنت کے احکام کے مطابق تبدیل کیا جائے گا (دفعہ ۲۲۷) ۔ ملکی قوانین کے احکامِ اسلام سے متصادم یا مطابق ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے ۱۹۸۰ء میں وفاقی شرعی عدالت (Federal Sharia Court) قائم کی گئی (دفعہ ۲۰۳ ۔ الف)۔ ان تمام دستوری دفعات کا تقاضا ہے کہ شریعت کو ملک کا بالاتر قانون صاف لفظوں میں تسلیم کیا جائے تاکہ اس امر کو تعبیر کے نتیجہ میں اخذ نہ کیا جائے بلکہ دستور کی واضح نص کے ذریعہ متعین کردیا جائے ۔ ۱۹۸۵ء میں آٹھویں ترمیم کے وقت اسی امر کا مطالبہ کیا گیا تھا ' اور اس وقت قومی اسمبلی اور سینٹ نے علیحدہ علیحدہ قراردادوں کے ذریعہ اس اصول کو تسلیم کیا تھا کہ قرآن و سنت ملک کا بالاتر قانون

تسلیم کئے جائیں گے' لیکن اس وعدہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اب شریعت ایکٹ کے ذریعہ دستور کے اس منشاء کو قانون کا درجہ دیا گیا ہے' مگر حقیقی معنوں میں قرآن و سنت کو بالا تر قانون Supreme Law کی حیثیت ابہام اور تنازع سے پاک اسی وقت حاصل ہوگی جب اس بات کو صاف الفاظ میں دستور ہی میں لکھا جائے۔ اس دستوری ترمیم کا وعدہ وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف صاحب نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس (۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء) میں عمرہ کے لئے تشریف لے جانے سے پہلے واضح الفاظ میں کیا تھا۔ شریعت ایکٹ کے ذریعہ اس مطالبہ کے تسلیم کئے جانے کا جو مرحلہ طے ہوا ہے وہ کمزور اور ناقص ہے۔ اب اصل کام اس وقت ہوگا جب دستور میں بھی یہ شامل کیا جائے کہ قرآن و سنت ہر قانون سے ' بشمول دستور کے ' بالا تر قانون ہوں گے۔

○

شریعت ایکٹ کے مخالفین نے اس دفعہ کو خصوصیت سے اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں ان کے اعتراضات پر کلام کیا جائے۔ ہم معترضین کے محرکات پر بات نہیں کریں گے البتہ ہماری کوشش ہوگی کہ جو علمی اعتراضات اس دفعہ پر کئے گئے ہیں ان کا تعاقب کریں۔ بنیادی طور پر پانچ اعتراضات ہیں جو اس دفعہ پر کئے گئے ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ قرآن و سنت ملک کے قانون کا ماخذ (Sources of Law) ہوسکتے ہیں' ملک کا بالا ترین قانون (Supreme Law) نہیں۔ اس لیے شریعت کو ملک کا بالا ترین قانون کہنا صحیح نہیں۔ اس موقف کی تائید میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پاک میں احکام کے علاوہ امم سابقہ کے قصص و حکایات ' اخلاق و اصول ' ترغیب و ترہیب ' انفس و آفاق کے شواہد سب ہی کچھ موجود ہے۔ اس بناء پر اسے بالاتر قانون نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت قانون کا اعلیٰ ترین ماخذ ہیں ' خود قانون نہیں۔ مزید دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن نے اپنے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ قانون ہے بلکہ اس نے اپنے آپ کو صرف ہدایت کہا ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ علماء اور خصوصیت سے اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والوں نے قیام پاکستان کے بعد سے قرآن و سنت کے ماخذ قانون بنائے جانے کا مطالبہ تو کیا ہے' مگر بالاتر قانون بنانے کا نہیں کیا۔ یہ ایک بالکل نئی بات ہے جو اب کہی جا رہی ہے۔

۳۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شریعت کو بالا ترین قانون ماننے کے معنی یہ ہیں کہ پارلیمنٹ قانون سازی کے حق سے محروم ہوجائے گی اور یہ پارلیمنٹ کی بالادستی کے خلاف ہے۔

۴ ۔ چوتھا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ ـــــــ چونکہ اس کے نتیجہ میں عدالتیں شریعت کے نفاذ میں بلاواسطہ شریک ہوجائیں گی اور خلاف شریعت قوانین کو کالعدم کرسکیں گی اس لئے ان کا یہ حق دراصل پارلیمنٹ کی بالاتر حیثیت کو مجروح کرے گا۔ اس طرح ایک قسم کی دو عملی وجود میں آئے گی، جس سے بہت خلفشار پیدا ہوسکتا ہے ۔

۵ ۔ ایک اور اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار تو دیا جا رہا ہے لیکن عدالتوں، خصوصاً" نچلی عدالتوں (Lower Courts) کے مجسٹریٹ اور جج حضرات شریعت کا کافی علم نہیں رکھتے، اور وہ شریعت کی تعبیرو تشریح میں فاش غلطیاں کرسکتے ہیں ۔ اس سے بھی ذہنی خلفشار اور قانونی الجھاؤ اور ژولیدہ فکری پیدا ہوگی ۔ یہ صورت حال نفاذ شریعت کے لیے ممد و معاون نہیں ہوگی ۔

○

ہماری نگاہ میں شریعت ایکٹ کی سب سے اہم، بلکہ اصل دفعہ، یہی ہے جو شریعت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دیتی ہے ۔ اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اسلام اللہ کی حاکمیت کے اصول کو قائم کرتا ہے۔ اسلام نام ہی اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام معاملات میں " حکم " یعنی اصل فیصلہ کرنے والا قرار دینا ہے ۔ نہ فرد اصل فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے اور نہ پارلیمنٹ یا عدالت ـــــــ بلکہ سب اللہ کو اصل فیصلہ کرنے والی قوت تسلیم کرتے ہیں اور اس کے معنی قرآن و سنت کو ـــــــ پورے قرآن کو نہ کہ اس کے کسی جز کو اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنت کو نہ کہ اس کے ایک حصہ کو ـــــــ فرقان یعنی حق و باطل میں تمیز کرنے والا ماننا ہے ۔ قرآن اس حقیقت کو بہت صاف الفاظ میں بیان کرتا ہے :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (سورۃ یوسف ۴۰

حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں ۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت (پرستش، بندگی اور اطاعت) نہ کرو ۔ یہی صحیح دین ہے ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ..... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ..
... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدۃ ـ ۴۴)

جو اللہ کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی دراصل کافر

ہیں .... وہی فاسق ہیں .... وہی ظالم ہیں ۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ (النساء۔ ۱۰۵)

ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس علم کے ساتھ فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دیا ہے۔

وَقُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ‌ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمُ (الشوریٰ۔ ۱۵)

اور (اے نبیؐ) کہدو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (اس کتاب کے مطابق) عدل کروں۔

ستم ظریفی ہے کہ کہا گیا ہے کہ قرآنِ پاک نے اپنے آپ کو قانون نہیں کہا، بلکہ صرف ہدایت کہا ہے ۔ حالانکہ قرآن اپنے بارے میں صاف الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ کا قانون ہے اور فیصلہ کی میزان اور کسوٹی ہے ۔ قرآن کے لئے الکتاب کا لفظ ساٹھ سے زیادہ بار استعمال ہوا ہے ۔کتاب کے معنی فرض اور حکم کے بھی ہیں ۔ خود قرآنِ پاک میں کتاب کا لفظ قانون خداوندی اور حکم کے معنی میں متعدد بار استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا (النساء۔ ۱۰۳) كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ۔ ۱۸۳) كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ (البقرہ ۔۲۱۶)

مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب "عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکمرانی" میں اس پر مفید بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ

"کتاب کے معنی فرض اور حکم کے بھی ہیں ۔ جرمن لفظ (Vorschrift) اور فرانسیسی اور انگریزی لفظ (Prescription) روسی لفظ "پرید سیانیئے" اور ہسپانوی لفظ (Prescripcion) (بمعنی فرض و حکم) کا مادہ بھی کتاب ہی کے معنی رکھتا ہے" (صفحہ ۸۲)

قرآنِ مجید نے اپنے لئے حکم اور فرقان کی اصطلاحیں جب بھی استعمال کی ہیں، یہ اس کے بالا تر قانون اور فیصلہ کرنے والی آخری اتھارٹی ہونے کی حیثیت کو ثابت کرتی ہیں (ملاحظہ ہو امام راغب اصفہانی۔ المفردات)

اِنَّمَا كَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا (النور۔ ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف تاکہ رسولؐ ان کے درمیان فیصلہ کرے' تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے تسلیم کرلیا۔

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (النساء ـ ۶۵)

پس اے نبیؐ! تیرے رب کی قسم' وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے تمام معاملات میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسرو چشم قبول کرلیں۔

اور اس بات کو دوسری جگہ فرما کر قرآن و سنت کے بالاتر قانون ہونے کے اصول کو خود قرآن نے ہمیشہ کے لئے طے کردیا:

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا (الاحزاب ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسولؐ کردے تو پھر ان کے لئے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرلینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑگیا۔

وہ معترضین جو اس ایکٹ میں قرآن و سنت کے بالاتر قانون لکھنے پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں' ہم ان کو دعوت دیتے ہیں کہ قرآن پاک کی مندرجہ بالا نصوص پر کھلے ذہن سے غور کریں اور پھر سوچیں کہ کیا قرآن بعینہ اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ اسے بالاتر قانون ہی تسلیم کیا جائے؟۔ اس کے ساتھ اس آیت کریمہ پر بھی غور کرلیں تو انہیں اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کرنے میں مدد ملے گی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ وَھُمْ مُّعْرِضُوْنَ (آل عمران ـ ۲۳)

تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے

ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلہ کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔

جب قرآن خود اس امر کا مطالبہ کرتا ہے کہ اسے بالاتر قانون مانا جائے تو پھر کوئی اور دلیل لانے کی حاجت نہیں۔ دستور میں قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کا دروازہ ضرور بند کیا گیا ہے، مگر مثبت طور پر قرآن کو بالاتر قانون قرار نہیں دیا گیا، جو اس کا حقیقی مقام ہے۔ شریعت ایکٹ شریعت کی اس حیثیت کو واضح کردیتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اسی بات کو دستور میں بھی واضح الفاظ میں درج کیا جائے، تاکہ کسی دائرے میں بھی کسی طرح کا کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

○

کہا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی بات ہے جو پہلے نہیں کہی گئی۔ لیکن یہ اعتراض بھی حقائق سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اہلِ علم ہر دور میں اسلامی حکومت اور ریاست کی یہی تعریف بیان کرتے رہے ہیں کہ اس میں قرآن و سنت کو بالا ترین قانون تسلیم کیا جاتا ہے۔

مولانا حامد الانصاری غازی ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہونے والی کتاب "اسلام کا نظامِ حکومت" میں کہ جو تقسیم ملک سے قبل شائع ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی کئی بار شائع ہو چکی ہے، امام ابو حنیفہؒ کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ "اسلام کا مقصد اسلام کی حکومت کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسلام کی حکومت کا مفہوم کیا ہے، صرف یہ کہ ہم سب خدا کے اطاعت گزار اور خدا کی حکومت کے حکمبردار ہیں" (**الاسلام ھو التسلیم والانقیاد لا وامر اللہ تعالیٰ۔ فقہ اکبر ص ۷۹**)

(اسلام کا نظام حکومت۔ تیسرا ایڈیشن صفحہ ۴۴)

یہی مصنف قرآن پاک کے "قانونِ کلّی" ہونے پر مفصل بحث کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ
"قرآنِ حکیم اسلام کا قانون کلّی ہے" (صفحہ ۱۲۹)

"قرآنِ عظیم کی قانونی حیثیت صاف اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہمیں اس کے صفحات میں مقنن اعلیٰ کے جو فرامین ملتے ہیں ان سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ یہ کتاب روحانیت اور اخلاق کی طرح تہذیب و تمدن کا ضابطہ اور حکومت اور سلطنت کا قانون کلی ہے"

(صفحہ ۱۷۳)

"اسلامی حکومت، اپنی حکمت عملی کے قلمرو میں، ایک مکمل، بلند و بالاتر، تحریری مجموعہ قانون (قرآن حکیم اور کتاب مسطور) کی پابند ہے" (صفحہ ۱۷۱)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ سنت اور قانون سازی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کو اسوۂ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے۔" (عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی (۱۹۸۱ء) صفحہ ۱۳۰)

محمد اسعد (Leopold Weis) اپنی کتاب "اسلامی مملکت و حکومت کے بنیادی اصول" (ترجمہ مولانا غلام رسول مہر' لاہور ۱۹۶۳ء) میں لکھتے ہیں:

"اسلام نے مسلمانوں پر لازم قرار دے دیا ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلوں کو اس الٰہی قانون کی رہنمائی کے تابع رکھیں جو قرآن لے کر آیا ہے اور جس پر عمل کا نمونہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکات نے پیش کیا۔ اس وجہ سے امت کے حق قانون سازی پر قطعی پابندیاں عائد ہوگئیں اور ارادہ عوام کو بالاتری حاصل نہ رہی جو مغرب کے تصور جمہوریت کا لاینفک جزو ہے۔" (کتاب مذکور۔ صفحہ ۳۹)

○

ہم نے یہ حوالہ جات ان اہل علم کے دیئے ہیں جو مطالبہ دستور اسلامی سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے تاکہ خالص علمی پوزیشن واضح ہو جائے۔ رہا معاملہ تحریک اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا' تو انہوں نے شروع ہی سے یہ بات کہی تھی کہ شریعت بالاتر قانون ہے' اور اس کا دستور کی زبان سے اظہار ضروری ہے۔ بلاشبہ انہوں نے قرآن و سنت کے ماخذ قانون ہونے کی بات بھی کہی ہے' لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ قرآن و سنت کو بالاتر قانون تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اسلام کے مقاصد کی تکمیل دونوں باتوں کے تسلیم کئے جانے سے ہوتی ہے۔ اپنی اس تاریخی تقریر میں جو "پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے؟" کے موضوع پر لاء کالج لاہور میں ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو کی گئی تھی اور جس سے مطالبۂ نظامِ اسلامی کی مہم کا آغاز ہوا تھا مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ ملک کی دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ

> "ریاست کا اساسی قانون شریعتِ خداوندی ہے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں پہنچی ہے۔" (اسلامی قانون صفحہ ۵۲)

فروری ۱۹۵۸ء میں جو بین الاقوامی مجلس مذاکرہ لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس میں مولانا مودودیؒ نے "اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے اپنے مقالہ میں فرمایا:

"اسلام اپنی ساری دعوت ہی اس بنیاد پر اٹھاتا ہے کہ انسان کو اپنی اخلاقی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے اس قانون شرعی کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جو اس نے اپنے انبیاء کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اس قانون شرعی کو ماننے' اور اس کے مقابلہ میں اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانے کا نام وہ "اسلام" رکھتا

ہے' اور صاف صاف الفاظ میں انسان کے اس حق کا انکار کرتا ہے کہ جن معاملات کا فیصلہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کردیا ہو' ان میں وہ خود اپنی رائے سے کوئی فیصلہ کرے"۔

(اسلامی ریاست صفحہ ۴۴۰)

پھر اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے صاف الفاظ میں انہوں نے کہا

"یہی محمدی تعلیم (یعنی قرآن و سنت) وہ بالاتر قانون (Supreme Law) ہے جو حاکم اعلیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔"

(اسلامی ریاست صفحہ ۴۴۰)

یہ چند اقتباس اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ قرآن و سنت کو بالاتر قانون تسلیم کرنا ہمارے مطالبہ میں ہمیشہ شامل رہا ہے۔ البتہ مخصوص حالات کی بناء پر جس موقع پر جتنی بات منوائی جاسکی اس کی کوشش کی گئی۔ سابقہ ۴۰ سال کے تجربے سے یہ سبق ملتا ہے کہ قانون اور دستور میں واضح الفاظ میں شریعت کو بالاتر قانون تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس میں مقننہ اور عدلیہ دونوں نفاذِ شریعت کے عمل میں بیک وقت مؤثر ہوسکیں گے۔

ایک ضروری تصحیح

رسائل و مسائل حصہ اوّل

ایک نیک دل کرم فرما نے خط میں توجہ دلائی ہے کہ رسائل و مسائل حصہ اوّل ص ۶-۳۹۵ پر سورۂ توبہ کی آیت ۲۴ کے نقل کرنے میں ایک لفظ چھوٹ گیا ہے۔ یعنی قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ ..... الخ ... میں لفظ ازواجکم درج نہیں ہوا جو اخوانکم کے بعد اور عشیرتکم سے پہلے ہونا چاہئے۔ مزید لغزش یہ ہوئی کہ ترجمے میں اخوانکم اور ازواجکم' دونوں کا ترجمہ غائب ہے۔

ان اغلاط کی تصحیح کے لئے اسلامک پبلیکشنز کو مطلع کر دیا گیا۔

بعدازاں ہم نے ترجمان القرآن جلد ۲۷ عدد ۱'۲ (ماہ جولائی و اگست ۴۵ء) کے رسائل و مسائل کے صفحات کو دیکھا جہاں سے یہ سوال جواب نقل ہوا تھا۔ اس میں آیت ۲۴ (سورہ توبہ) تو مُستفسر نے اپنے خط میں لکھی ہے اور وہی لفظ ازواجکم کو چھوڑ گئے ہیں۔ پروف ریڈر بھی اس غلطی پر متوجہ نہ ہو سکے۔ لیکن آیت کا ترجمہ وہاں ٹھیک درج ہے۔ معلوم نہیں اس میں غلطی کس طرح پیدا ہوئی۔

ویسے اگر یہ مولانا مودودیؒ کی تحریر ہوتی تو غالباً وہ خود چیک کرتے۔

قارئینِ ترجمان القرآن میں سے جو اصحاب فائل رکھتے ہوں وہ متعلقہ شمارہ میں تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

"تاریخ جماعتِ اسلامی" حصہ دوم کا باب اول

تاسیس و قیامِ جماعت

(پہلی قسط)

آباد شاہ پوری

قیامِ جماعت کے لئے اذان پکار دینے کے بعد' اس ضمن میں صفر ۱۳۶۰ھ کے ترجمان القرآن میں جو اعلان شائع ہوا' اس میں ان تمام لوگوں کو دعوت دی گئی تھی' جو اسلامی تحریک کے لئے کام کرنے والی جماعت کے نظریہ' مقصد اور نصب العین سے متفق تھے اور اس کے لئے مجوزہ نقشۂ کار کے مطابق عملی جدّوجہد کرنے کی تڑپ رکھتے تھے ا۔ کہ وہ اجتماعی ہیئت اختیار کرنے کے لئے مجتمع ہوں گے' چنانچہ اس دعوت کے جواب میں لبیک کہنے کے منتظر افراد کی طرف سے اطلاعات پہنچنے لگیں۔ ان اطلاعات سے پتہ چلتا تھا کہ ملک میں ایسے اصحاب کی خاصی تعداد موجود ہے جو جماعت اسلامی کی تشکیل اور اس کے نظریہ سے متفق ہیں اور اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جدّوجہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بعض مقامات پر لوگوں نے اپنے طور پر جماعتی حلقے قائم کر لئے ہیں اور دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ اجتماع کی تاریخ یکم شعبان ۱۳۶۰ھ (۲۵ اگست ۱۹۴۱ء) مقرر کر دی گئی اور جن لوگوں نے جماعت اسلامی میں شمولیت کا ارادہ ظاہر کیا تھا' ان سب کو ہدایت کر دی گئی کہ جہاں اجتماعی حلقے وجود میں آگئے ہیں وہاں سے صرف منتخب نمائندے اور جہاں لوگ ابھی انفرادی صورت میں ہیں وہاں سے حتی الامکان ہر شخص آجائے۔ ۲۔

اہلِ جنوں کی آمد

لوگ ۲۸ رجب ہی سے آنے لگے۔ یکم شعبان تک تقریباً ساٹھ اصحاب پہنچ چکے تھے۔ باقی آنے والوں کا انتظار تھا۔ بعض دیگر وجوہ کی بناء پر بھی اجتماع یکم شعبان کو شروع نہ ہو سکا۔ یہ سارا دن آنے والوں نے باہمی ملاقاتوں' تعارف اور تحریک کے متعلق تبادلۂ خیال میں گذارا۔ اور یہ سلسلہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں صبح سے شام تک جاری رہا۔ شام کو لوگ دیر تک ترجمان القرآن کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ تقریباً ہر شخص کے مرکزِ توجہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی" تھے' وہ جن کی پکار ان سب کو یہاں کھینچ لائی تھی۔ لوگ مختلف نوعیت کے مسائل پیش کرتے اور سیّد صاحب" انہیں حل کرتے رہے۔ نماز عشاء تک یہی رنگِ محفل رہا۔

قافلۂ شوق کا رنگ و آہنگ

اگلے روز ۲ شعبان ۱۳۶۰ھ (۲۶ اگست ۱۹۴۱ء) کو صبح آٹھ بجے باقاعدہ اجتماع شروع ہوا۔ ۷۵ افراد ہندوستان کے گوشے گوشے سے اسلامیہ پارک' پونچھ روڈ لاہور کی مبارک (حال ریاض قدیر) مسجد کے سامنے فصیح منزل سے متصل ایک مکان میں واقع ترجمان القرآن کے دفتر میں سمٹ آئے تھے اور ایک ایسا فیصلہ کرنے چلے تھے جو وقت اور تاریخ کے دھارے کو متاثر کرنے والا تھا۔ ان ۷۵ حضرات کی فہرست غالباً" محفوظ نہیں رہی یا شاید اس کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہ ہو سکا! البتہ اس دوران میں جو مختلف روایات سامنے آئیں' ان کی روشنی میں اجلاس میں شریک ہونے والے جماعت اسلامی کے تقریباً پچاس فی صد بانی ارکان کی فہرست مرتب ہو گئی تھی۔ اس فہرست کی رو سے مندرجہ ذیل اصحاب تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے تھے:

۱- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۲- مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان- بریلی (حال لکھنؤ)

۳- ملک نصراللہ خان عزیزؒ بی اے (لاہور) ملک صاحب تاسیسی اجتماع میں شامل نہیں تھے (طفیل محمد)

۴- میاں طفیل محمد بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ کپور تھلہ

۵- چوہدری عبد الرحمٰن صاحب (راہوں ضلع جالندھر)

۶- مولانا سید عبد العزیز شرقی (جالندھر)

۷- چوہدری محمد اکبر ایم اے بی ایڈ (سیالکوٹ)

۸- مستری محمد صدیق صاحب- سلطان پور لودھی ریاست کپور تھلہ

۹- حافظ فتح اللہ (راہوں ضلع جالندھر)

۱۰- جناب نعیم صدیقی (فضل الرحمان)

۱۱- قمرالدین خان ایم اے

۱۲- مولانا صدر الدین اصلاحی ضلع اعظم گڑھ- یوپی- انڈیا

۱۳- مولانا سید صبغت اللہ بختیاری (فاضل دیوبند' دارالارشاد' مدراس)

۱۴- مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی - خطیب شاہی مسجد کپور تھلہ

۱۵- مولانا نذیر الحق میرٹھی

۱۶- ڈاکٹر سید نذیر علی زیدی (الٰہ آباد)

۱۷ - جناب محمد بن علی علوی کاکوروی ' لکھنؤ

۱۸ - شیخ فقیر حسین بی اے۔ سلطان پور لودھی ریاست کپور تھلہ

۱۹ - ماسٹر عزیز الدین صاحب ۵ ۔ شہر کپور تھلہ (فیصل آباد آکر کوہ نور مل کے پاس انھوں نے جماعت کو مقامی مرکز کے لئے اراضی دی)

۲۰ - شیخ نذر محمد (سید اسعد گیلانی نے ڈاکٹریٹ کے اپنے مقالے میں جس کا ذکر آگے آتا ہے' نذر حسین لکھا ہے' یہ شیخ فقیر حسین کے بھائی تھے اور ان کا بیان زیادہ قرین صحت ہے۔) ان کا نام نذر محمد ہی ہے۔ یہ شیخ فقیر حسین مرحوم کے بھائی تھے (طفیل محمد)

۲۱ - شیخ فضل محمد ۶۔

۲۲ - مولوی محمد علی (فیروز پور) ۷۔

۲۳ - سید محمد شاہ ایم اے ۸۔ لاہور

۲۴ - چوہدری عبد الغنی۔ گہلن چک ۹۔ نزد پتوکی ضلع قصور

۲۵ - قاضی حمید اللہ بی اے (سیالکوٹ) ۱۰۔

۲۶ - ملک غلام علی بی اے (جسٹس ریٹائرڈ) خوشاب

۲۷ - عبد الجبار غازی ایم اے بی ٹی پرنسپل اینگلو عربک کالج دہلی

۲۸ - سید محمد حسنین جامعی بی اے دربھنگہ

۲۹ - چوہدری نصرت حسین بی اے بی ٹی (گوجرہ)

۳۰ - چوہدری غلام جیلانی بی اے ۱۱۔

۳۱ - شیخ عبد الحمید پھگواڑا ریاست کپور تھلہ ۱۲۔

۳۲ - عطاء اللہ پتوا کھالی (بنگال) ۱۳۔

سید اسعد گیلانی نے اپنی مطبوعہ کتاب' تاریخ جماعت اسلامی' میں جدید و قدیم تعلیم یافتہ اصحاب کی الگ الگ فہرست دی ہے۔ علماء کی فہرست میں وہ مندرجہ بالا فہرست میں شامل بعض علماء کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کے اسماء کا اضافہ کرتے ہیں:

۳۳ - مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانوی

۳۴ - مولانا محمد علی کاندھلوی سیالکوٹ

۳۵ - مولانا محمد عبد اللہ روڑی' حصار

۳۶ - مولانا محمد عبد اللہ وتنا کیم (مدراس)

۳۷ - مولانا محمد الیاس ندوی گوندلوی ضلع گوجرانوالہ

۳۸ - مولانا الٰہی بخش ڈیرہ جاڑہ، سرگودھا

۳۹ - مولانا عبد القادر عاجز قصوری ۱۴۔

اس ادھوری فہرست کو ڈاکٹر سیّد اسعد گیلانی کی تازہ ترین تحقیق نے مکمل کر دیا۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ کے لئے جو تحقیقی مقالہ جماعت اسلامی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) قلم بند کیا اس میں جماعتِ اسلامی کے ۷۵ بانی ارکان کی مکمل فہرست دی ہے۔ ہر نام کے ساتھ عمر اور مقام کے کوائف اور تصدیق کنندہ کا نام اور حوالہ دیا ہے۔ بلا شبہ یہ فہرست ایک محقّق کی محنت کا شاہکار ہے۔ اس فہرست میں ملک نصر اللہ خان عزیز، مولانا صدر الدین اصلاحی، عبد الجبار غازی، چوہدری غلام جیلانی اور مولانا عطاء اللہ حنیف کے اسماء شامل نہیں ہیں۔ باقی ۱۴ اصحاب حسبِ ذیل ہیں :

۱ - محمد عبد اللہ مصری (یو پی)

۲ - سیّد محمد یوسف (بھوپال)

۳ - چوہدری چراغ دین سابق مینجر ماہنامہ ترجمان القرآن (گورداسپور) رحمان پورہ لاہور میں ہیں

۴ - سردار محمد اکبر خان (کیمبلپور)

۵ - سلطان محمود غازی مرووال (خوشاب)

۶ - عبد المجید صدیقی پرانی انار کلی (لاہور)

۷ - منظور احمد

۸ - حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی (یوپی)

۹ - شمس الحق صدیقی (یو پی) سکھر آکر فوت ہوئے۔

۱۰ - حافظ محمد زکریا ایم اے (امرتسر) سرگودھا آکر فوت ہوئے۔

۱۱ - ماسٹر حاجی محمد شفیع (امرتسر) گوجرانوالہ آکر فوت ہوئے۔

۱۲ - چوہدری رفیع الدین (بارہ بنکی) یو پی

۱۳ - مولوی محمد یونس (حیدر آباد دکن)

۱۴ - عبد القادر صاحب (حیدر آباد دکن)

۱۵ - صوفی صابر علی (لدھیانہ) راولپنڈی میں ہیں

۱۶ - عطاء اللہ سجاد (کپور تھلہ) لاپتہ

۱۷ - سید عظمت علی شاہ (کپور تھلہ) بعد تقسیم اوکاڑہ آکر چوہدری عبد الرحمٰن وغیرہ کے ساتھ اوکاڑہ بس سروس قائم کی (طفیل محمد)

۱۸ - حکیم سید محمد حسن بخاری (کپور تھلہ) ۱۵ء ملتان آکر فوت ہوئے۔

۱۹ - حاجی محمد صاحب (پتوکی)

۲۰ - حافظ محمد شریف احسن (سرگودھا)

۲۱ - چوہدری محمد شفیع بی اے بی ٹی (گجرات)

۲۲ - عبد الرحمٰن خان۔ یہ چوہدری عبد الرحمٰن کپور تھلہ کے ہیں جو بعد تقسیم اوکاڑہ کی جماعت کے امیر رہے۔ یہ خان نہیں صرف چوہدری ہی تھے۔ (طفیل محمد)

۲۳ - مولوی محمد فاضل (مدراس) ضلع گورداسپور

۲۴ - چوہدری شفیع احمد (یوپی)

۲۵ - حکیم شیر محمد (لدھیانہ) ضلع ملتان میں آکر آباد ہوئے اور وہیں فوت ہوئے (طفیل محمد)

۲۶ - مولوی محمد ابراہیم (فیروز پور) اب شہداد پور سندھ میں ہیں۔ (طفیل محمد)

۲۷ - بابا محمد بخش (سرگودھا)

۲۸ - بابا احمد بخش (سرگودھا)

۲۹ - حکیم محمد خالد (الٰہ آباد)

۳۰ - محمد اسحاق صاحب (الٰہ آباد)

۳۱ - ناظر شمسی (دہلی) پاکستان سروس سے ریٹائر ہو کر اب گلبرگ لاہور میں ہیں۔

۳۲ - ماسٹر اکبر علی (فیصل آباد)

۳۳ - ڈاکٹر محمد اسلم چغتائی (امرتسر) سرگودھا میں فوت ہوئے۔

۳۴ - صابر علی صاحب (الٰہ آباد)

۳۵ - شاکر علی صاحب (الٰہ آباد)

۳۶ - ظہور احمد جبار اللہ (الٰہ آباد)

۳۷ - عبد المجید چھوٹانی (بمبئی)

۳۸ - مولوی عبد القادر (پتوکی)

۳۹ - محمد انور (لاہور)

۴۰ - تسنیم قریشی (لکھنؤ)

۴۱۔ مولوی امام الدین فائق (پٹنہ) ۱۶؎

جماعتِ اسلامی کے تاسیسی ارکان کی اس فہرست سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیّد مودودیؒ کے اثرات کہاں کہاں پہنچ چکے تھے ۱۷؎۔ ان میں قابل لحاظ تعداد علما کی تھی۔ اسی تناسب کے ساتھ اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ افراد تھے' ایسے اصحاب بھی تھے جو متوسط تعلیم یافتہ تھے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد وہ تھی جو کالجوں اور یونیورسٹیوں اور قدیم دینی مدارس سے تازہ دم فارغ ہو کر آئے تھے یا ہنوز قدیم و جدید درس گاہوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان میں شہری بھی تھے اور دیہاتی بھی' سرکاری ملازم بھی تھے ہنر مند اور پیشہ ور بھی' کالجوں' اسکولوں اور مدرسوں کے اساتذہ بھی تھے اور ڈاکٹر اور صحافی بھی' کاشتکار بھی تھے اور زمیندار بھی' تاجر بھی تھے اور دستکار بھی۔ ان کی اکثریت مسلم معاشرہ کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ خود سیّد صاحبؒ کا تعلق بھی متوسط طبقہ ہی سے تھا۔ ان میں جو زمیندار تھے وہ بھی چھوٹے تھے یا طبقۂ اوسط سے آئے تھے۔ عمر کے لحاظ سے یہ لوگ انیس بیس برس سے لے کر چالیس پچاس برس کے پیٹے میں تھے۔ ان میں سب سے معمر ڈاکٹر نذیر علی زیدی تھے جن کی عمر ۵۲ برس تھی۔ خود سیّد مودودیؒ اس وقت ۳۸ برس کے تھے۔ جیسا کہ ہر دعوت اور تحریک کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے کہ اس کو قبول کرنے والے اوّلاً زیادہ تر نوجوان ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت دعوت اسلامی کی تھی۔ اس پر لبیک کہنے والوں کی اکثریت بھی نوجوانوں پر مشتمل تھی۔

اقتصادی اور معاشی اعتبار سے یہ حضرات چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر غریب اور کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جن لوگوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی مستحکم اور استوار ہو چکی تھی وہ بڑی حد تک خود کفیل تھے۔ خوش حال عنصر نہ ہونے کے برابر تھا۔ نوجوانوں کی اکثریت یا تو ابھی اپنے گھر والوں کی دستِ نگر تھی یا معاشی میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی جدّوجہد کر رہی تھی۔ دینی فکر اور مسلک کے لحاظ سے یہ لوگ اہل السنّۃ کے تقریباً ہر مکتب فکر سے آئے تھے۔ سیاسی فکر کے اعتبار سے بڑی عمر کے اصحاب میں سے اکثر یا تو تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترک موالات میں کسی نہ کسی رنگ میں عملاً حصہ لے چکے تھے یا کم از کم ان کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ رہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو کانگریس کے پرچم تلے جنگِ آزادی میں اس امید میں شریک رہے تھے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہو گی' تحریکِ اسلامی کے لٹریچر نے ان پر پہلی بار اس سنگین حقیقت کو آشکارا کیا تھا کہ وہ کعبہ پہنچنے کے لئے کعبہ کی راہ پر چلنے کے بجائے ترکستان کے راستے پر سرابوں کا تعاقب کرتے رہے ہیں۔ نوجوانوں کی ایک

بڑی تعداد ان سیاسی طوفانوں کے زمانے میں طفولیت اور ابتدائی تعلیمی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس طرح وہ اپنے ذہنوں میں ان تحریکوں کے تاثرات لئے ہوئے جوان ہوئی تھی۔ پھر تحریک خلافت کے بعد مسلمان معاشرے پر الحاد و بے دینی اور فکری و تہذیبی فتنوں کا جو ہجوم شروع ہوا' اور انگریزی تعلیم و تہذیب کے شجرِ خبیثہ نے جو گُل کھلائے' ان سے بھی نوجوانوں کی خاصی تعداد متاثر ہو کر الحاد و گمراہی کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی' دعوت اسلامی نے ان سب کی دست گیری کی اور انھیں تباہ کن وادیوں اور راہوں سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر ڈالا۔ پھر وہ نوجوان بھی تھے جو تحریک خلافت کے بعد شروع ہونے والی سیاسی تحریکوں سے متاثر تھے۔ ان میں احراری بھی تھے اور خاکسار اور مسلم لیگی بھی۔ تحریک اسلامی کے لٹریچر نے ان کے فکر و نظر کی دنیا بدل ڈالی۔ اس طرح چند علاقوں کو چھوڑ کر بر صغیر کے تقریباً ہر علاقے اور مسلم معاشرے کے ہر طبقے اور دائرے سے ہر فقہی مسلک اور ہر سیاسی نقطۂ نظر رکھنے والے لوگوں کے اندر سے چھٹ کر اور ایک نصب العین پر یکسو ہو کر ایک اجتماعی ہیئت اختیار کرنے کے عزم کے ساتھ یہ لوگ یہاں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بولی (dialect)' نسل' رنگ' اور عام لباس' رہن سہن ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے' پھر یہ جن علاقوں سے آئے تھے ان میں ہزاروں میل کی مسافتیں تھیں' تاہم جس دین نے انھیں ایک اُمت بنا دیا تھا اور ان کے اندر فکری و تہذیبی اشتراک پیدا کر دیا تھا' اس نے ساری دوریاں اور فاصلے ختم کر دیئے تھے۔ ان کی سوچ یکساں تھی' ان کے جذبات یکساں تھے' ان کے دل ایک مقصد اور نصب العین کے لئے دھڑک رہے تھے۔

پھر یہ لوگ جس ماحول سے نکل کر آئے تھے وہ کسی ٹھوس کام کے لئے سخت ناسازگار تھا۔ مادیت زندگی پر غالب آچکی تھی اور لوگ مادی منفعتوں کو اخلاقی و دینی قدروں' بے لوث خدمت اور بے مزد مساعی پر ترجیح دیتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم اتحادی طاقتوں کے لئے خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی اور اس کے اثرات برّ صغیر کی اجتماعی زندگی پر پڑ رہے تھے۔ ملک کے اندر معاشی و سیاسی تغیرات بڑی تیزی سے فیصلہ کن انداز میں آرہے تھے۔ ہر طرف اخلاقی خلفشار برپا تھا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کو مغرب زدگی نے آلیا تھا۔ تحریک خلافت کے دوران میں تہذیب فرنگی کے خلاف جذبات و عمل کی جو فضا پیدا ہوئی تھی وہ معدوم ہو چکی تھی اور فرنگی افکار اور تہذیبی قدروں نے مسلم معاشرے پر از سر نو جارحانہ حملہ کر دیا تھا اور اس حملے کے جلو میں آنے والے فتنے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم پانے والی نئی نسل کو بری طرح اپنی لپیٹ

میں لے چکے تھے۔ عام مسلمان بر صغیر کی دوسری قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اقتصادی بد حالی اور اخلاقی انحطاط میں گرفتار تھے۔ علماء فروعات پر بحث و جدال میں مصروف تھے۔ ضال اور مضل گروہوں اور غیر اسلامی فرقوں نے' جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر امت کے درمیان سرگرم عمل تھے' اس بگاڑ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگرس جس کی بنیاد متحدہ وطنی قومیت پر رکھی گئی تھی اور جو سیکولر جماعت ہونے کی مدعی تھی' اب ہندو قوم پرستی اور اس کے تہذیبی احیاء کا کھلا نشان بن گئی تھی اور ۱۹۳۰ء میں اس نے مسلمانوں کو نظرانداز کر کے جنگِ آزادی لڑنے کا جو اعلان کیا تھا' اس پر عمل پیرا ہو کر آزاد ہندوستان کے درو بست پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنے کی جدوجہد کے آخری مرحلے میں قدم رکھ چکی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ جس کا قیام مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے حصول و تحفظ کے لئے عمل میں آیا تھا' مختلف مراحل سے گزر کر اپنا ایک واضح مقصد ——— حصولِ پاکستان ——— متعین کر چکی تھی۔ پاکستان کی ریاست اور اس کے نظامِ حکومت کے بارے میں اگرچہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اسلامی ہو گا' لیکن اس ریاست کے حصول کی جدوجہد کرنے والی اس جماعت کی تنظیم نو انہی بنیادوں پر کی جا رہی تھی جن پر کوئی بھی قوم پرست تنظیم کھڑی کی جاتی ہے اور جس کی جدوجہد کا منطقی نتیجہ سیکولر قومی حکومت کے قیام ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس طرح دونوں ملک گیر جماعتوں میں زبردست کشمکش شروع ہو چکی تھی اور اس کشمکش نے بر صغیر کی سیاست میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ ہر طرف ولولہ انگیز جذباتی نعرے گونج رہے تھے جو اپنے ساتھ قلوب و اذہان کو بہائے لئے جا رہے تھے۔ ایسے ہنگامہ خیز حالات میں "ایک خاموش اور بے لذّت تحریک" ۱۸؎ کے لئے معاشرہ کے ہر گروہ اور طبقے سے ان مٹھی بھر افراد کا چھٹ کر آنا فی الحقیقت ایک حوصلہ افزا مستقبل کی غمازی کرتا تھا۔ جماعتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ادھر کوئی جماعت وجود میں آتی ہے ادھر مفاد پرستوں کا ہجوم اس کے مناصب پر قبضہ کرنے کے لئے امڈ پڑتا ہے' لیکن بقول سیّد مودودیؒ ہنگامہ پسندوں' شہرت کے طلب گاروں' جاہ پرستوں' جوشیلے اور جذباتی آدمیوں کے لئے اس جماعت کے اندر کشش کی کوئی چیز نہ تھی کہ کوئی اس میں حصّہ لینے کا خیال کرتا ۱۹؎۔ چنانچہ وہی لوگ اس جماعت کی طرف آئے تھے جن کے اندر خالصتہً لوجہ اللہ اقامت دین کا کام کرنے کی تڑپ تھی' جو دیکھ رہے تھے کہ اس راہ میں دور دور تک لذّت یابی اور جاہ طلبی کا کوئی امکان نہیں' جن کے اندر کسی مفاد کا خیال لائے اور کسی منفعت کی توقع کئے بغیرِ پتّہ ماری سے کام کرنے کا عزم اور حوصلہ تھا۔

اجتماع کا پس منظر

پھر ان لوگوں کو محض کسی حادثے نے یہاں جمع نہیں کر دیا تھا اور نہ انھیں بلانے والے نے اپنے دل میں اٹھنے والی کسی وقتی موج کی پکار پر اپنی قیادت و سیادت کا سکہ جمانے اور چوہدراہٹ قائم کرنے کے لئے بلایا تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے گہرے مطالعہ' سوچ بچار اور دعوت و تبلیغ کا ایک پورا دور کارفرما رہا تھا۔ سید مودودیؒ کے اپنے الفاظ میں یہ ان کے ۲۲ سال کے مسلسل تجربات' مشاہدات' مطالعے اور غور و خوض کا نچوڑ تھا' جس نے ایک اسکیم کی شکل اختیار کی تھی ۲۰۔ اور جس کی طرف وہ گزشتہ نو برس سے شب و روز بلاتے رہے تھے۔ پھر جماعت تشکیل دینے سے پہلے سید صاحبؒ متواتر چار برس تک اس وقت تک برصغیر میں کام کرنے والی مسلمان جماعتوں اور قیادتوں کو توجہ دلاتے رہے کہ ان کے کرنے کا کام ہے تو یہ ہے۔ اگر ان کے پیشِ نظر آزاد ہندوستان یا پاکستان میں واقعی اسلام کا نفاذ' مسلمانوں کا تہذیبی تحفظ اور اسلامی حکومت کا قیام ہے تو پھر انہیں اپنی جماعتوں کو اسلامی خطوط پر منظم کرنا اور اسلامی نصب العین کو مرکز جہد و عمل بنانا چاہئے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے کارکنوں کے فکر و کردار کی تربیت اور ایک مشنری کی حیثیت سے اسلامی طریقِ کار کو اختیار کرتے ہوئے سعی و جہد کرنی چاہئے۔ ان جماعتوں سے مایوس ہونے کے بعد بھی سیّد صاحبؒ کی یہی کوشش رہی کہ اللہ کا کوئی اور بندہ اٹھے اور اس کام کو منظم کرے۔ وہ اسلامی تحریک کے احیاء اور اقامت دین کے لئے جدّوجہد کرنے والی جماعت کا خاکہ پیش کر کے تقریباً چار مہینے انتظار کرتے رہے کہ جو لوگ تقویٰ' تجربہ اور سن و سال میں ان پر فوقیت رکھتے ہیں' ان میں سے کوئی صاحب اٹھیں اور اس کام کے لئے عملی اقدام کریں ۲۱۔ لیکن جب کوئی بھی آگے نہ بڑھا تو سیّد صاحبؒ خود آگے بڑھنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کوئی اور کام کرتا یا نہ کرتا' سیّد صاحب کی زندگی کا تو یہ نصب العین تھا اور وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ جئیں گے تو اسی نصب العین کی خاطر اور مریں گے تو اسی نصب العین کے لئے۔ اس طرح اسلامی نصب العین کے لئے عملی جدوجہد کرنے کی جو پکار سیّد صاحبؒ نے بلند کی وہ ایک سوچی سمجھی پکار تھی اور اسمیں بلانے والے کی کسی ذاتی غرض کا کوئی شائبہ نہ تھا یہ پکار خالصتہً اللہ کے لئے تھی اور اسی کے توکّل پر بلند کی گئی تھی۔ برصغیر کی یہ پہلی اجتماعی ہیئت تھی جو کسی اچانک رونما ہونے والے حادثے کے نتیجے میں نہیں بلکہ طویل عرصے کے غور و خوض اور سوچی سمجھی سکیم کے ساتھ قائم کی جا رہی تھی ۲۲۔ اور جس کے پیچھے داعی کا رضائے الٰہی حاصل کرنے اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر جو فریضہ عائد ہوتا تھا اس کو انجام دینے کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ یہ نقشۂ کار محرم ۱۳۶۰ھ کے ترجمان القرآن کے اشارات میں پیش کیا جا چکا تھا۔ جسے بعد ازاں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں ایک صالح جماعت کی ضرورت' کے عنوان سے شامل کر دیا گیا۔

۲۔ تحریری دعوت نامہ ڈیڑھ سو اصحاب کو بھیجا گیا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے ادارۂ دارالاسلام کے ساتھ رابطہ قائم کر رکھا تھا اور وہ بھی جو سید صاحبؒ کی دعوت سے متاثر ہو کر ایک مدت سے اپنے طور پر انفرادی طور پر یا حلقے بنا کر کام کر رہے تھے اور جنہوں نے صفر ۱۳۶۰ھ کے ترجمان القرآن میں اعلان پڑھ کر رابطہ قائم کیا۔ سید اسعد گیلانی نے اپنی کتاب "تاریخ جماعت اسلامی" میں وہ دعوت نامہ محفوظ کر لیا ہے جو چوہدری عبد الغنی مرحوم (کھمن چک نزد پتوکی ضلع لاہور حال ضلع قصور) کو جن کا تعلق مؤخر الذکر گروہ سے تھا' ارسال کیا گیا (ص ۴۵۷' ۴۵۸)

۳۔ روداد جماعت اسلامی حصہ اول' لاہور مکتبہ جماعت اسلامی ص ۴

۴۔ تاریخ جماعت اسلامی از چوہدری غلام محمد مرحوم' باب جماعت اسلامی' (قلمی مسودہ)۔ چوہدری صاحب مرحوم نے ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم کو تاسیسی اجتماع کے شرکاء میں شامل کیا ہے' لیکن ملک صاحب کے انتقال پر سید مودودیؒ نے جو تعزیتی بیان جاری کیا تھا اس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ ملک صاحب تاسیس جماعت کے پندرہ دن بعد جماعت اسلامی میں شریک ہوئے' (ہفت روزہ ظاہر لاہور ۱۰ جولائی تا ۱۶ جولائی ۱۹۷۶ء ص ۷) ملک صاحب کو دعوت کے بارے میں کچھ شکوک تھے۔ جماعت قائم ہوئی تو وہ سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے' سید صاحبؒ نے ان کے شکوک تو رفع کر دیئے تاہم وہ کئی دن تک مذبذب رہنے کے بعد یکسو ہوئے اور جماعت میں شرکت اختیار کی۔ خود ملک صاحب مرحوم نے بھی ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ جماعت اسلامی قائم ہونے کے بعد وہ کئی دن اضطراب کی آگ میں تڑپتے رہے کہ جس مقصد (اسلامی حکومت کے قیام) کے لئے تم نے ساری عمر آزادی کی جدوجہد کی اور قید و بند میں مبتلا ہوئے' اس خالص مقصد کو نصب العین بنا کر ایک جماعت جدوجہد کے لئے میدان میں آگئی ہے' تم اس سے الگ رہ کر اپنے اللہ کو کیا جواب دو گے ؟ اسی احساسِ جواب دہی نے انہیں جماعت اسلامی کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا کہ آخر دم تک سرگرم جہد و عمل رہے۔

۵۔ روایت میاں طفیل محمد' تذکرۂ سید مودودیؒ ص ۲۱۱

۶۔ روایت شیخ فقیر حسین مرحوم تذکرۂ سید مودودیؒ ص ۲۵۹

۷۔ تذکرۂ سید مودودیؒ ص ۳۳۲

۸۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی و سلیم منصور خالد "خطوط مودودیؒ" لاہور البدر پبلی کیشنز اپریل ۱۹۸۳ء ص ۸۹

۹ - ہفت روزہ ایشیا لاہور

۱۰ - عبد الغنی فاروق' کاروانِ عزیمت جلد اوّل لاہور' ادارۂ معارف اسلامی مارچ ۱۹۸۷ء ص ۱۵ نیز اسعد گیلانی' تاریخ جماعت اسلامی ص ۲۸۱

۱۱ - اسعد گیلانی' تاریخ جماعت اسلامی ص ۲۸۱' ۲۸۲۔ ان حضرات کے علاوہ سید اسعد گیلانی اپنی تاریخ میں مندرجہ بالا فہرست میں شامل نمبر ۴ ' ۵ ' ۷ ' ۸ ' ۱۰' ۱۱' ۱۶' ۱۷' ۲۳ اور ۲۵ سے متعلق اصحاب کا نام بھی دیتے ہیں۔ اسعد صاحب نے بھی ملک

نصراللہ خان عزیز کو تاسیسی ارکان میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم حاشیہ ۶ میں وضاحت کر چکے ہیں۔

۱۲ - ہفت روزہ ایشیا لاہور، یکم نومبر ۱۹۸۷ء ص ۱۵

۱۳ - خطوط مودودیؒ ص ۵۹

۱۴ - اسعد گیلانی، تاریخ جماعت اسلامی ص ۲۷۶، ۲۷۷

۱۵- روداد جماعت اسلامی حصہ دوم میں حکیم صاحب کا نام محمد حسین لکھا ہے ص ۴۴۔ ان کا صحیح نام محمد حسن ہی ہے (طفیل محمد)

۱۶- ڈاکٹر سیّد اسعد گیلانی کی مرتب کردہ ۷۵ بانی ارکان کی یہ فہرست اجتماع جماعت اسلامی پنجاب (۸ تا ۱۰ مارچ ۱۹۹۱ء منصورہ، لاہور) کے موقع پر اجتماع گاہ میں ایک بورڈ پر لگائی گئی جس کا عکس ماہنامہ آئین لاہور نے اپنی مئی ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع کیا ص ۲۶ - ۲۷

۱۷- دعوت اسلامی کے تاثرات کا مختصر ذکر ہم اپنی کتاب تاریخ جماعت اسلامی حصہ اول میں کر چکے ہیں۔ ان متاثرین میں قدیم و جدید درس گاہوں سے نکلے ہوئے اکابر اور اصاغر بھی تھے۔ اکابر میں اچھی خاصی تعداد ایسے اصحاب کی تھی جو دعوت اسلامی کے لٹریچر میں نوجوانوں کی فکری اور اعتقادی گمراہیوں کا علاج پاتے تھے۔ (ص ۵۱۵) تاسیس جماعت سے پہلے جو اصحاب دعوت سے متاثر ہو چکے تھے اور بعد ازاں اگلے دو تین برسوں میں جماعت اسلامی کے رکن بنے۔ ان میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی، سید نقی علی، مولانا عبد الغفار حسن، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا محمد اسماعیل عمری (مدراس) مولانا محمد یوسف، مولانا عبد العزیز (کوئٹہ) مولانا ابواللیث اصلاحی، عبد الجبار غازی، پروفیسر عبدالبشیر آذری، تاج الملوک، سردار علی خان (سیرے) سید فضل معبود، چوہدری علی احمد خان، سید ممتاز حسین، خواجہ محمد صدیق وغیرہ نمایاں اصحاب تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اگرچہ تاسیسی اجتماع میں شریک نہیں ہوئے، تاہم انہیں اس موقع پر رکن بنا لیا گیا تھا کیوں کہ اسی اجتماع میں شوریٰ کے اجلاس میں انہیں الٰہ آباد، بنارس، گورکھپور، فیض آباد ڈویژن اور صوبہ بہار کا امیر مقرر کیا گیا تھا اور جماعت میں مناصب صرف ارکان ہی کو دیئے جاتے تھے۔ مولانا صدر الدین اصلاحی تحریک اسلامی میں شریک ہونے والوں میں السابقون الاولون میں تھے۔ وہ تحریک دارالاسلام کے بانی ارکان میں سے تھے۔ دارالاسلام (جمالپور) میں سیّد مودودیؒ کے ساتھ رہے اور چوہدری نیاز علی خان کے ساتھ اختلاف کی بناء پر دارالاسلام چھوڑنا پڑا تو سیّد صاحبؒ کے ساتھ لاہور آگئے اور علمی و عملی دعوتی لٹریچر کی تیاری میں ان کا دست و بازو بنے رہے۔ اس تحریک کے باقی چاروں تاسیسی ارکان (دیکھئے مصنف کی کتاب تاریخ جماعت اسلامی حصہ اول) جماعت اسلامی کے تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے اور رکن بنے، لیکن ڈاکٹر سیّد اسعد گیلانی کی مرتب کردہ ۷۵ بانی ارکان کی فہرست میں صدرالدین اصلاحی کا نام شامل نہیں ہے، جب کہ چوہدری غلام محمد مرحوم کے قلمی مسودہ میں انہیں تاسیسی ارکان میں شمار کیا گیا ہے اور یہ مسودہ سیّد مودودیؒ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ دراصل مولانا صدر الدین اصلاحی ان دنوں اپنے وطن چلے گئے تھے اور وہاں سے رنگون، جہاں سے ان کی واپسی ۱۹۴۳ء کے ابتدائی مہینوں (اغلباً فروری کے اواخر یا مارچ کے آغاز) میں ہوئی (میں بھی حاضر تھا وہاں از حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی مندرجہ آئین لاہور ۱۵ فروری ۱۹۸۸ء ص ۲۷) شاید تحریک دارالاسلام کا بانی رکن ہونے کی وجہ سے سیّد صاحبؒ نے انہیں بانی ارکان میں شامل فرما لیا تھا۔ (میرے نزدیک بھی یہی بیان درست ہے۔ وہ تحریک دارالاسلام کے رکن تھے اور میرے سامنے ان کا ایک اجلاس ہوا۔ ن ص)

۱۸۔ یہ سیّد صاحبؒ کے اپنے الفاظ ہیں۔

۱۹۔ دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات ص ۴۹

۲۰۔ جماعت اسلامی کے ۲۹ سال ص ۵

۲۱۔ تحریک اسلامی مرتبہ پروفیسر خورشید احمد ص ۲۴۳

۲۲۔ یہاں جماعتی تنظیم کا ذکر کیا جا رہا ہے' تحریک کا نہیں' اسلام کے لئے کام کرنے والی تحریک بر صغیر میں سیّد احمد شہیدؒ بھی برپا کر چکے تھے اور وہ بھی سوچی سمجھی اور خالصتہً لوجہِ اللہ تھی۔

بقیہ: جماعت اسلامی کیا دیتی ہے

مخالف ہیں' جو دشمن ہیں یہاں حریف وہ بھی ہوتے ہیں جو پیارے ہیں' جو جگر کے ٹکڑے ہیں' جو عزیز ہیں۔ یہاں تیر و تفنگ کی لڑائی نہیں ہے۔ یہاں ذہن و فکر' دل و ضمیر میں لڑائی ہے۔ یہاں حق و باطل کا معرکہ بپا رہتا ہے۔ ہر لمحہ شیطان اپنی ذریات سے حملہ آور ہوتا رہتا ہے۔ یہ سرد جنگ ہے' ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ کبھی کبھی گرم جنگ میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اطاعت رب میں ساری زندگی بسر کر دینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

دوسری حالت کارکن کی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ ابھی تیاری کر رہا ہے۔ وہ ابھی ٹریننگ کیمپ میں ہے۔ جو کارزار میں ہیں' انہوں نے تو اپنی ساری پونجی میدان جنگ میں جھونک دی اور وہ شاداں و فرحاں ہیں۔ جو ابھی سپاہی ہیں' تیاری کے مرحلے میں ہیں' ان کے اندر شوق انگڑائیاں لیتا ہے اور لمحہ بہ لمحہ فزوں ہوتا رہتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن مجید فرماتا ہے:

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا۔ اور ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا۔ اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انہوں نے اپنے رویّہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔ (الاحزاب۔ ۲۲)

تحریکِ اسلامی میں شامل ہونا سعادتِ دارین حاصل کرنے کا زینہ ہے۔

شیخ احمد یاسین، تحریکِ انتفاضہ کی روحِ رواں

حیرت زار شخصیت، سبق آموز کارنامہ

منیر احمد خلیلی

یہ شخص بچپن سے منفرد و ممتاز رہا ہے۔ اس کی غیر معمولی شخصیت ہمیشہ سے حیرت خیز ثابت ہوتی رہی۔ علمِ نفسیات کے مطابق جس طرح غبی، نالائق اور نکمے بچے اپنے والدین اور اساتذہ اور ماحول و معاشرہ کے لیے ایک ٹیڑھا مسئلہ ہوتے ہیں، غیر معمولی حد تک ذہین، چابکدست اور باصلاحیت بچے اس سے بڑھ کر نازک مسئلہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت کو زنگ لگنے، جذبوں کو سرد ہو جانے، سرگرمیوں کو ماند پڑ جانے اور صلاحیتوں کو کند ہو جانے سے بچانے کے لئے عام بچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ توجہ، تربیت و رہنمائی اور سرپرستی و نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ احمد یاسین صغیر سن تھا، تب بھی اپنی بستی اور محلے کی مسجد میں بزرگوں سے بڑھ کر باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ حاضر ہوتا اور عبادت میں اس کی معصومانہ محویّت سے عمر رسیدہ لوگ بھی مسرّت بھری حیرانی میں مبتلا رہتے تھے۔ فلسطینی مہاجرین کے غزّہ میں واقع کیمپ میں سکول تھا۔ یہ بچہ اس سکول کا انوکھا اور تشویش ناک طالب علم ثابت ہوا۔ مدرسے کے تمام اساتذہ پریشان تھے کہ اس طالب علم پر طاری چپ اور خاموشی کی طویل کیفیت کو کیوں کر ختم کیا جائے اور اسے کیسے آمادہ کیا جائے کہ یہ اپنے معصوم وجود کے اندر احساسات و جذبات کا جو لاوا پال رہا ہے اسے اگل دے، آج بھی یہ عقدہ نہیں کھلا کہ اس عرصے میں اس پر خاموشی کا جو دورہ پڑا تھا اس کا اصل سبب کیا تھا۔ تاہم اس کی بعد کی سرگرمیوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فلسطینی عوام پر صلیبی ریشہ دوانیوں اور صیہونی قہر و جبر کی جو چکّی چل رہی تھی، اس نے معصوم اور حسّاس طبع پر ایسا اثر کیا کہ کم عمر طالب علم طویل عرصہ تک سکتے کی حالت میں ڈوبا رہا۔

دردناک حادثہ

پھر یہی احمد یاسین لڑکپن کی حدود میں پہنچا تو اس کا یہ مرحلۂ زندگی بھی کچھ کم غیر معمولی نہ تھا۔ اس عرصے میں یہ کھیلتا اور ورزش کرتا تھا، لیکن اس کے کھیل خطرناک اور اس کی ورزشیں بڑی سخت ہوتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی بڑی صعوبت اور مشقّت سے گزرنے کے

لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہے۔ اس دور کی اس کی یہی مہم جوئی اور کٹھن پسندی اسے ایک خوفناک حادثے سے دوچار کر گئی۔ ایک دن وہ سر کے بل گرا اور گردن کے قریب سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے پچک کر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس حادثے میں اس کی جان تو بچ گئی لیکن اعصابی نظام تباہ ہو گیا اور یہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ہاتھ پاؤں شل اور پورا وجود ناکارہ لیکن اس کے اندر کا عظیم انسان اور قوی اور مضبوط ہو گیا۔ اس کے ارادوں میں کوئی ضعف آیا اور نہ اس کے مستقبل کے پروگرام معطّل ہوئے۔ نوجوان احمد یاسین کی معذوری اسے عمل گاہِ حیات سے دھکیل کر باہر نہ کر سکی۔ وہ پیشۂ تدریس سے منسلک ہونے کی غرض سے انٹرویو اور امتحان کے لیے مقابلے میں اترا تو انٹرویو کمیٹی کے سامنے اس کے دوستوں نے اٹھائے ہوئے اسے ایسے رکھا جیسے بے جان لاش رکھی جاتی ہے۔ اس کمیٹی کے لیے اس سے زیادہ اچنبھے کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ آزادانہ حرکت سے عاری گوشت کا یہ ڈھیر عملی زندگی میں شرکت ہی کا نہیں، صحیح سالم اور صحت مند لوگوں کے ساتھ مقابلے کا حوصلہ اور سکت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسے منتخب کیے بنا اس کمیٹی کے پاس کوئی چارہ نہ رہا اور اس کے ارکان یہ دیکھ اور جان کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ علم و ثقافت اور دینی و ادبی معلومات کے اعتبار سے نقل و حرکت سے عاجز و معذور یہ نوجوان بڑے امتیازی درجے پر کھڑا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ انھوں نے جو ریمارکس لکھے وہ یہ تھے "محنتی، صاحبِ مطالعہ، وسیع معلومات کا حامل بلکہ سب پہلوؤں سے سب سے ممتاز و بلند"۔

معمارِ ملّت

اٹھا کر لائے اور واپس لے جائے جانے والا یہی نوجوان ایک دن استاد بن گیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اس کا مشن تھا۔ اس میدان میں اس نے خونِ جگر سے سینچ سینچ کر اپنے شاگردوں کو علمی اور اخلاقی و روحانی اعتبار سے پروان چڑھانے کا زبردست کام کر دکھایا۔ اس کی کارکردگی پر سربراہِ ادارہ سے لے کر افسرانِ بالا تک تعجب کا اظہار کرتے اور پھر مدرسے کا استاد احمد یاسین غزّہ کی پٹی میں مختلف مساجد میں ایک جلیل القدر عالمِ دین اور داعی و مبلّغ کی حیثیت میں سامنے آیا تو منبر و محراب کی زینت، فلسطینی نسلِ نو کا مربی اور مظلوم و ستم رسیدہ قوم کا عظیم قائد بن گیا۔ اپنے علم، تواضع، زہد و ورع اور صدق و اخلاص کی بناپر بہت جلد اس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ نوجوانوں کی عقیدت، ان کا احترام، تعظیم و توقیر کے جذبے اس معذور و مفلوج شیخ پر نچھاور ہونے لگے۔ مقبوضہ فلسطین کے جیّد اور متبحّر و ممتاز علما اس نئے "شیخ" کی عالمانہ و

داعیانہ شان کو رشک و مسرّت کی نگاہوں سے دیکھتے نظر آئے۔ اس حیرت زار ہستی کے ذریعے جنم پانے والی حیرتوں نے ۱۹۸۷ء کے اواخر تک پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اٹھنے بیٹھنے کی حد تک بھی دوسروں کے محتاج احمد یاسین نے "**حرکتہ المقاومتہ الاسلامیتہ**" (جس کا مخفّف "حماس" ہے) کے نام سے ایک تنظیم کھڑی کی اور اس کے زیرِ اہتمام دسمبر ۱۹۸۷ء میں وہ عظیم' ایمان افروز اور بے مثال تحریک برپا کی جس نے صیہونیوں کی نیندیں اڑا دیں اور اسرائیل کے سرپرستوں کے آہنی مؤقف بدل ڈالے۔

مسجدوں سے اٹھنے والی تحریک انتفاضہ نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کی توجہ کھینچ لی۔ آزادیٔ فلسطین کی جدّوجہد کو دہشت گردی کا نام دے کر نظرانداز بلکہ بدنام کرنے والے امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں کو بھی غلیلوں سے پتھر برسا کر صیہونی فوج اور پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے نوخیز بچوں کی اس تحریکِ حریت و جہاد کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بدل کر اسے نئے زاویوں سے دیکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس تحریک نے فلسطین کے مسئلے کو دنیا کے سامنے نئے عنوان اور نئے انداز سے متعارف کرایا ہے۔ اب یہ پون صدی سے یہودی قہرمانیوں' بربریت و وحشت کے سامنے کھڑی' حقوق سے محروم' مادر وطن گنوائے ہوئے' ظلم سہتی ہوئی ایک قابلِ رحم قوم کا مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔

پیدائش اور پے در پے مہاجرت

شیخ احمد ۱۹۳۹ء میں غزّہ شہر سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں بحرِ ابیض کے مشہور ساحلی قصبے عسقلان کے مقابل ایک گاؤں الجورہ میں پیدا ہوئے۔ احمد یاسین نام رکھا گیا اور والدہ سعدہ عبداللہ الھبیل کی نسبت سے احمد سعدہ کی کنیّت سے بھی پکارے جانے لگے۔ چار بھائیوں میں ان کا تیسرا نمبر تھا۔ ابھی تین سال ہی کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یتیمی کے تلخ اور جھلسا دینے والے نئے حالات میں معصوم بچے کا سفر زندگی آگے بڑھنے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کی ناجائز ولادت ہوئی۔ فلسطینیوں کی غریب الوطنی' مظلومیت اور بے بسی کے ایک نئے اور اندوہ ناک دور کا آغاز ہوا۔ دوسرے بہت سے خاندانوں کے ساتھ یہ کنبہ بھی غزّہ کی پٹی پر مہاجرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ کچھ مدت بعد غزّہ شہر میں آبسے۔ پچیس سال جوں توں کرکے یہاں گزارے۔ کچھ اہلِ خیر کے مالی تعاون سے غزّہ شہر کے جوار میں ایک بستی جورۃ الشمس میں گھر کی تعمیر ممکن ہوگئی تو وہاں منتقل ہوگئے۔

تعلیم و تربیت کے مراحل

ابتدائی اور پرائمری درجے تک کی تعلیم مدرسہ امام شافعیؒ اور پرائمری سکول برائے مہاجرین غزّہ میں حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں پرائمری اور ۱۹۵۸ء میں میٹرک کے امتحان کی سند حاصل کی۔ جامعہ قاہرہ میں داخلہ لیا لیکن سلسلۂ تعلیم جاری نہ رہ سکا۔ وسائلِ زندگی یہودیوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ بے شمار فلسطینی کنبے اس دور میں عسرت و ادبار اور مشکلات و مصائب میں زندگی گزار رہے تھے۔ عام فلسطینی گھرانے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم ولانے کا خواب دیکھنے کے بھی قابل نہ تھے۔ اکثر ماں باپ کی یہ انتہائی خواہش ہوتی تھی کہ مڈل میٹرک کے بعد ان کے بیٹے کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر کے خاندان کی کفالت میں معاون اور سہارا بن جائیں۔ فلسطینی پناہ گزینوں کی گزر بسر کا بڑا ذریعہ عالمی اور مقامی ادارے برائے امدادِ مہاجرین کی طرف سے معمولی راشن اور نقدی تھا۔ حالات کی یہ سنگین چٹانیں تھیں جن سے بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح شیخ احمد یاسین کی خواہشوں اور تمناؤں کی کمزور سی کشتی بار بار ٹکرائی۔ آج سخت معذوری کے باوجود حریت و جہاد کا علم اپنے شل ہاتھوں میں تھامنے والے احمد یاسین کے قلب و ذہن میں کم سنی کے اس دور میں محرومیوں' مجبوریوں' مایوسیوں اور حسرتوں کے نہ معلوم کتنے کانٹے دائمی چبھن چھوڑ گئے ہوں گے اور کانٹوں سے لگنے والے زخموں سے ابھرنے والے کرب ہی نے اسے غاصب' ظالم اور مسلمانوں کے بدترین دشمن کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا ہوگا۔

تحریکِ اسلامی سے تعلق

رواں صدی کی پانچویں دہائی عالمِ عرب کی دینی بیداری کی ایک نئی اور عظیم لہر اپنے دامن میں لیے نمودار ہوئی۔ امام حسن البنّا شہیدؒ کی برپا کردہ تحریک اپنے اثرات دور دور تک پھیلا چکی تھی۔ پیر و جواں' اعلیٰ اور نیم تعلیم یافتہ' ملازم و کسان' استاد اور طالب علم' پرانی روایتی درس گاہوں اور نئی تعلیمی آماجگاہوں میں یکساں طور پر اور نہایت سرعت کے ساتھ اخوان المسلمین' کی فکر قبولیت پا رہی تھی۔ دینی شعور و فہم اور ایمان و ایقان کے روح پرور جھونکے مصر کی سرحدیں پار کر کے دوسرے عرب ممالک کو بھی گراں خوابی کے سحر سے نکلنے کا پیغام دے رہے تھے۔ اخوان المسلمین کے مخلص' انتھک اور روحِ ایمان سے سرشار داعیوں کے اثرات کی لپیٹ میں فلسطینی نوجوان بھی آنے لگے تھے۔

حالتِ جنگ اور ضرورتِ جہاد کو محسوس کرتے ہوئے تحریکِ اسلامی نے تعلیمی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ جسمانی ریاضت کا بھی ایک تربیتی کورس مقرر کر رکھا تھا۔ احمد یاسین اس فکر

کے حامل اور ان جسمانی مشقوں کے سرگرم شریک تھے۔ اسی طرح کی مشقوں کے دوران میں وہ ایک بلند چٹان سے کودتے ہوئے سر کے بل گرے اور ان کی گردن کے قریب سے ریڑھ کی ہڈی کے فقرے ٹوٹ گئے۔ یہی حادثہ انہیں مستقل معذوری کا شکار کرنے کا باعث بنا اور سارا اعصابی نظام تباہ ہو گیا۔ ان جسمانی مشقوں کے انسٹرکٹر مشہور مجاہد عبداللہ صیام تھے جنھوں نے ۱۹۸۲ء بیروت میں خالدہ کا معرکہ سر کرتے ہوئے اسرائیلیوں کے ہاتھوں شہادت پائی۔

شادی اور رفیقۂ حیات کے ساتھ کٹھن سفر

احمد یاسین ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل نہیں۔ اپنے طور پر حرکت کرنا اور ایک سے دوسری جگہ جانا ان کے لیے ناممکن ہے۔ معاشی سرگرمیاں اور کنبے کی کفالت کرنا ان کے بس میں نہیں۔ لیکن ایک عظیم خاتون حلیمہ حسن یاسین نے معذوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے' اس مجاہدِ بے مثال کے ساتھ رفیقۂ حیات کے طور پر آغازِ سفر کا عزم کر لیا۔ رشتہ دار خاتون کے ساتھ ازدواج کا زندگی بھر کا تعلق ۱۹۶۹ء میں قائم ہوا۔ یہ خاتون ایثار کا عمل اور تکمیلِ عہدِ وفا کی سعی اس طرح جاری رکھے ہوئے ہیں کہ اپنے نامور مگر مفلوج شوہر کی کرسی کو کھینچنے اور جملہ حوائج میں ان کی مدد کرنے کے لیے جیل میں ان کے ساتھ رہنے کو رضا کارانہ طور پر ترجیح دے کر بے اعلان کی سزا بھگت رہی ہیں۔

داعیانہ رول اور اس کے اثرات

شیخ احمد یاسین ابنائے وطن کے افسوسناک حالات سے اپنی شعوری زندگی کے کسی مرحلے میں بھی بے نیاز و لاتعلق نہ تھے۔ وہ اس درد کو محسوس کرتے تھے جو صیہونی ستم کاریوں کے نتیجے میں بے بس فلسطینیوں کے دل سے اٹھتا اور ماحول اور فضا میں سرایت کر جاتا تھا۔ غلامی و محکومی اور مہاجرت و فلاکت کے وہ زخم انہیں بھی لگتے تھے جن کے کرب سے ہر فلسطینی بچہ بڑا تڑپ رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء ہی سے صورت حال کا جائزہ لینے اور مصر کی تحریک اسلامی کے اثرات کے تحت آزادیٔ وطن کے لیے منصوبوں پر غور و تدبّر میں ان کا ذہن مصروف اور سوچ وقف تھی۔ زبان میں تاثیر اور دل میں اصلاح کا جذبہ اسی وقت سے موجیں مار رہا تھا۔ دعوت و اصلاح کی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ قائل کرنے اور دائرہ اتفاق میں لانے کی صلاحیت بروئے کار آ رہی تھی۔ اس دور میں فلسطین کی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری عبداللہ نمر درویش احمد یاسین ہی کی گفتگو سے متاثر ہو کر کمیونسٹ نظریات سے تائب ہوئے اور اسلام کے خادموں کی صف میں

شامل ہوئے تھے' آج شیخ کے قریب ترین رفقا میں سے ہیں۔ اصلاحِ افکار اور تعمیرِ کردار کی مہم کے لیے شیخ احمد یاسین نے مسجد کی مرکزی اور تقدّس و کشش سے بھرپور حیثیت کو خوب سمجھا اور اپنی داعیانہ اور مجاہدانہ سرگرمیوں اور کاوشوں کے لیے مسجد ہی کو مرکز بنایا۔ عورتوں' بچوں اور مردوں کے لیے الگ الگ درس کے حلقے قائم کیے اور بڑی جانفشانی اور فکر و محنت کے ساتھ انقلابی افکار کی جوت جگانے لگے۔

عزائم اور منصوبوں میں عمل کے رنگ کا آغاز

ساتویں عشرے میں احمد یاسین کی مساعی افراد کو عظیم مقاصد سے روشناس کرانے کے بعد منظم کرنے اور ان سے کام لینے کی تدبیروں کا تقاضا کرنے لگی تھیں۔ دینی و دنیوی تعلیم اور جسمانی تعلیم و تربیت کا وہ تجربہ جو اخوانوں نے مجاہد سازی کے لیے پہلے کیا تھا وہ شیخ احمد کی خواہشوں میں بس رہا تھا۔ خواہش جذبہ بنی اور جذبے نے عزم کا روپ دھارا۔ اسی عزم نے **جمعیت المجمع الاسلامی** کو وجود بخشا۔ بہت جلد اس تنظیم کا دائرہ غزّہ سے تمام علاقے تک وسیع ہوگیا۔ اس فورم سے خاص طور پر طلبا کی علمی و فکری' جسمانی اور نظریاتی جہتیں درست کی جاتیں۔ ان کی صلاحیتوں اور قوتوں کو ابھارنے کا کام ہوتا۔ اس تنظیم کے طے کردہ نصابِ عمل و فکر سے گزر کر مزید تعلیم اور روابط کے لیے ایک خاص پلاننگ کے تحت بیرون فلسطین' خاص طور پر سعودی عرب کی جامعات میں بھیجا جاتا۔ وہاں سے تعلیم اور نظری تربیت کی تکمیل کرکے آنے والوں کی خدمات کو غزّہ کی اسلامی یونیورسٹی میں قائم مرکز سے منسلک کر دیا جاتا۔ اس مرکز میں ان نوجوانوں سے کام لینے کے طریقِ کار کا تعیّن پہلے سے ہو چکا تھا۔ جذبہ حریت و جہاد اور شوقِ شہادت کی آبیاری کے ساتھ ساتھ ان کو خدمتِ قوم و وطن کی روح سے بھی سرشار کیا جاتا۔ کچھ سے رفاہی کام لیے جاتے۔ کچھ حفظانِ صحت کے ادارے چلانے پر مامور کیے جاتے۔ ناداروں اور ضرورت مندوں کی امداد و کفالت کے لیے لوگوں سے مالی تعاون حاصل کیا جاتا۔ گویا تربیت یافتہ افراد کو حتمی نصب العین کے لیے پکارنے سے پہلے مثبت اور تعمیری انداز میں مصروف رکھنے کا پورا انتظام کیا گیا۔ اس دوران میں شیخ احمد یاسین کے اثر اور ان کی مقبولیت و ہردلعزیزی کا یہ عالم ہوگیا کہ اہلِ وطن شادی بیاہ' مہر و طلاق' وراثت اور زمین جائداد کے تنازعات میں ان سے فیصلے کرانے اور فلسطینی عوام انہیں اپنا عظیم روحانی باپ سمجھنے لگے۔

انتفاضہ مبارکہ کا ظہور اور مسئلہ فلسطین کا نئے عنوان سے تعارف

۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ شیخ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے تخریبی

عمل کے لیے اسلحہ جمع کر رکھا ہے۔ یہودی جج نے مفلوج انسان کو تیرہ سال قید کی سزا سنا کر سفاکی کی انتہا کر دی۔ گیارہ ماہ قید کاٹ کر رہا ہو گئے۔ جذبوں کی فصل پک چکی تھی۔ ادھر صیہونی بجلیاں بھی کوند رہی تھیں۔ ڈر تھا کہ فصل اٹھانے سے پہلے ہی یہ بجلیاں سارے خرمن کو خاکستر نہ کر دیں۔ چنانچہ ایک عظیم تحریک کو برپا اور ایک حکیمانہ اور بلند منصوبے پر عمل کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا۔ مزید تاخیر خلافِ حکمت و مفاد تھی۔ ۸ دسمبر ۱۹۸۷ء کو اس تحریک کا آغاز ہوا جسے آج ساری دنیا انتفاضہ (UPRISING) کے نام سے جانتی ہے۔ حریت و جہاد کے پہاڑ جیسے جذبوں کا لاوا پھٹ گیا۔ مکروہ صیہونی چہرہ اس کے ہاتھوں مسخ ہونے لگا۔ یہ پہاڑ ابھی تک بدستور مصروفِ آتش فشانی ہے۔ انتفاضہ کا عمل جاری ہے۔ عرصہ تک تو دنیا کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس تحریک کی پشت پر کون سے متحرک ہاتھ اور کس کا رسا اور انقلابی ذہن کار فرما ہے۔ انتفاضہ کو کچلنے اور دبانے کی ہر وحشیانہ اور بہیمانہ کوشش کر دیکھنے کے بعد اسرائیلی حکام نے ۱۹۸۹ء میں اس کے قائد شیخ احمد یاسین کو گرفتار کر لیا۔

بطلِ حریت، مجاہد عظیم، فلسطینیوں کے قائد، مفتیٔ اعظم فلسطین الحاج امین الحسینیؒ جب تک تحریکِ آزادیٔ فلسطین کے روحِ رواں تھے۔ اس تحریک کا اسلامی تشخص نمایاں اور محسوس رہا۔ یہ محض عربوں اور فلسطینیوں کے مسئلے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ جب اپنے رب کے جوار رحمت میں پہنچ گئے تو تحریکِ حریتِ فلسطین مصر کے جمال عبدالناصر کے نظریات سے متاثر نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اسی عرصے میں بائیں بازو کے قوم پرست گروپوں کی ایک فصل سی اگ آئی۔ امریکہ اور روس کے مابین نظریاتی چپقلش اور مفادات کی سرد جنگ عروج پر تھی۔ روس امریکہ اور اس کے حلیف مغربی ملکوں کو زچ کرنے، شرقِ اوسط سے ان کے اثر کو کم کرنے کے لیے عرب ممالک میں مسلسل اپنے نظریاتی پاؤں پھیلا رہا تھا۔ روس کے پاؤں پڑ کر اور اس کے آلۂ کار کے طور پر استعمال ہو کر کچھ مفادات حاصل کرنے کے لیے کوشاں چھوٹے چھوٹے فلسطینی گروپ بازیابیٔ سرزمینِ وطن اور اہلِ فلسطین کے لیے باعزت طور پر جینے کے حق کے مطالبے سے زیادہ روسی قیادت کی نظر میں ایک دوسرے کی پوزیشن خراب کرنے اور اپنی اہمیت اجاگر کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ محدود اور ذاتی مفادات و اغراض کے پجاری ان گروپوں نے تنظیم آزادیٔ فلسطین میں اپنا غلبہ قائم کر لیا، اسلام سے وفاداری رکھنے اور اس تنظیم پر اسلامی رنگ دیکھنے کے متمنّی عناصر آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ انہیں دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگائے رکھا گیا۔ اہم مناصب پر سوشلسٹ، کمیونسٹ، قوم پرست عیسائی اور لادین لوگ

چھائے رہے۔ تحریکِ انتفاضہ اور 'حماس' (حرکتہ المقاومتہ الاسلامیتہ) کے قیام کے بعد جہاں فلسطین کے مسئلے کی نوعیت میں ایک جوہری فرق رونما ہوا ہے۔ وہاں فلسطینی عوام کی حقیقی نمائندگی و قیادت کا تعین بھی نئے سرے سے ہوگیا ہے۔ اندرون فلسطین اس مسئلے کو دنیا کی نظر میں لانے اور اپنے حقوق کی جنگ لڑنے والے اسلام کے شیدائی' شوقِ شہادت سے متلاطم دلوں کے مالک باعمل مسلمان ہیں۔ وہ کسی سرخ یا سفید سامراج کے تابع اور وفادار نہیں ہیں۔ انہوں نے جہد آزادی کو نئے عزم اور نئے انداز میں شروع کیا ہے۔ اس جدّوجہد میں ایک نیا اور توانا شعور کارفرما ہے کہ آزادی اور بازیابیٔ حقوق کا راستہ جہاد خالص کا راستہ ہے۔ یہ نئی تحریک مساجد اور حفظ قرآن کے مدارس سے پھوٹی ہے۔ یہ اسلام کے ساتھ اور اللہ کے لئے جینے مرنے کے عہد کی آئینہ دار تحریک ہے۔ بائیں بازو کی تنظیموں سے وابستہ نوجوان بھی اس نئے عزم و انداز اور اس تحریک کے قائد کے حلقہ بگوش بنتے جارہے ہیں۔ جن جن کو شیخ احمد یاسین کے ساتھ جیل میں کچھ لمحے گزارنے کا موقع ملتا ہے وہ اس معذور شیخ کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ کئی ایک کی رہائی کے احکام صادر ہوئے' انہوں نے اپنا نام واپس لینے اور رہائی کے لیے اس زعیمِ اسلامی اور قائدِ حریت کا نام پیش کرنے پر اصرار کیا۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین اور اس کے سربراہ یاسرعرفات اسرائیل کے لیے روز بروز لچک ظاہر کرکے نئی مراعات کی پیش کش کرتے ہیں۔ لیکن 'حماس' اندرون فلسطین کسی نرمی اور رعایت کو اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے میثاق سے غداری تصور کرتی ہے۔ عالمی سطح پر سیاسی و سفارتی میدان میں فلسطینیوں کی نمائندگی یاسرعرفات اور تنظیمِ آزادیٔ فلسطین کو سونپے رکھنا ایک مجبوری ہے ورنہ اندرون فلسطین صیہونی بندوقوں سے برسنے والی گولیوں کی بارش اور سنگینوں کے سائے میں سانس لینے اور بسنے والے عوام' جامعات کے استاد اور طلبا' ڈاکٹروں' انجنیئروں اور دیگر شعبوں سے وابستہ باشعور اور تعلیم یافتہ لوگوں کا ساٹھ سے ستر فیصد 'حماس' کا حامی اور شیخ احمد یاسین کا عقیدت کیش ہے۔ شیخ ۱۹۸۹ء سے پابندِ سلاسل اور پسِ دیوارِ زنداں ہیں۔ اس کے باوجود صیہونی حکام اور انتظامیہ اس لاچار و معذور انسان کی شخصیت سے اس قدر خائف ہے کہ جیل کے اندر بھی مقدمے کی کارروائی کئی مرتبہ ملتوی کی جاچکی ہے' مبادا عوامی جذبوں کا طوفان جیل کی دیواروں کو اڑا اور بہا کر لے جائے۔ لیکن طوفان تو اٹھ چکا ہے۔ ارادوں اور ارادتمندیوں کا طوفان' جذبوں اور شوقِ فراواں کا طوفان---- یہ طوفان دلوں میں' مدرسوں میں' جامعات میں' فلسطینی بستیوں اور قریوں میں ہلچل مچائے ہوئے ہے۔ اور یہ طوفان معذوری و

فالج سے ساکت و صامت شیخ احمد یاسین کے طفیل اٹھا ہے۔ اس نے صیہونی پنجوں میں جکڑی اور دبی پسی قوم کو شاید اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں اقبالؒ کا یہ پیغام دیا ہے ۔

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تُو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طُوفاں بھی ہے

شیخ احمد یاسین کی سزا کے خلاف احتجاج کیا جائے

قاضی حسین احمد ‘امیر جماعت اسلامی پاکستان

تحریک مزاحمت اسلامی فلسطین (حماس) کے بانی شیخ احمد یاسین کو اسرائیل کی طرف سے عمر قید کی سزا سنائے جانے کی شدید مذمت کرتے ہوئے قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی پاکستان نے کہا ہے کہ شیخ احمد یاسین جن کا پورا دھڑ فالج زدہ ہے اور جو تحریک حماس بنانے کے جرم میں ۱۹۸۹ء سے اسرائیلی جیلوں میں بند ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے مقبوضہ علاقوں کے فلسطینیوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی اور مردوں کے ساتھ ساتھ بچوں اور عورتوں کو بھی جدوجہد آزادی کے لیے متحرک کردیا۔

جناب قاضی حسین احمد نے کہا کہ حماس کے بانی کو ایسے وقت سزا سنائی گئی ہے جب امریکہ اپنے "نیو ورلڈ آرڈر" کے نشے میں مبتلا ہو کر پوری دنیا میں مسلح مداخلت کو اپنا حق سمجھتا ہے اور دنیا بھر کے جھگڑوں کو اپنے معیار کے مطابق نمٹانے کا حق تسلیم کروانا چاہتا ہے۔ امریکی معیار کے مطابق اسرائیل کی ناجائز ریاست کو پورے مشرق وسطیٰ کی قیادت کا حق حاصل ہے اور فلسطین کے اصل باشندوں کو دنیا بھر میں منتشر کرنا اور نیست و نابود کرنا بھی اسرائیلیوں کا حق ہے۔ عرب ممالک کے مصلحت کیش اور خود پسند حکمرانوں کو اسرائیل کے ساتھ امن کانفرنس کی میز پر بٹھا کر امریکہ اسرائیل کی بالادستی تسلیم کروانا چاہتا ہے۔

قاضی حسین احمد نے انسانی حقوق کی علمبردار عالمی تنظیموں اور دنیا بھر کے آزادی پسند عوام سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ شیخ احمد یاسین کے حق میں صدائے احتجاج بلند کریں۔ انہوں نے حکومت پاکستان سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ اقوام متحدہ میں اسرائیلی حکومت کے اس ظالمانہ رویے کے خلاف احتجاج کریں ---- امیر جماعت نے مزید کہا کہ شیخ احمد یاسین نے اپنی معذوری کی حالت میں پہلے بھی دلوں کو گرمایا ہے اور اب بھی اسرائیلی قید خانے ان کے سینے میں فروزاں آزادی کی شمع کو بجھا نہیں سکیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بانی حماس عزم و ثبات اور فداکاری کی اعلیٰ مثال ہیں۔ ہم انہیں اور ان کی تحریک حماس کے تمام لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جب تک فلسطین کا چپہ چپہ آزاد نہیں ہوجاتا۔ ہم ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کے چند گوشے

حافظ محمد یاسین بٹ

(آخری قسط)

آنحضرتؐ جب پہلی مرتبہ میدانِ جنگ میں گئے' اس وقت آپؐ کی عمر بیس سال کی تھی اور جنگ کا نام حربِ فجار تھا۔ اس جنگ کے بعد قبیلہ قریش نے ایک صلح نامہ طے کیا تھا جسے تاریخ میں "میثاقِ فضول" کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں طے پایا تھا کہ کوئی عرب مظلوم کے مقابلے میں ظالم کی مدد نہیں کرے گا۔ ۱

اسلامی معاشرے کے قیام یا یوں کہئے کہ حضورؐ کی بعثت سے بیس برس پہلے یہ معاہدہ ہوا تھا۔ اس سے قبل قریش کی تاریخ میں اس قسم کا کبھی کوئی معاہدہ نہیں کیا گیا تھا۔ جس مجلس میں اس معاہدے کو آخری شکل دی گئی تھی' اس میں خود آنحضرتؐ بھی شریک تھے۔ آپؐ کی زندگی کی یہ پہلی سیاسی مجلس تھی' جس میں آپؐ نے شرکت فرمائی۔ آپؐ کا اپنا ارشاد ہے کہ میں "حلف الفضول" کے موقع پر موجود تھا اور یہ معاہدہ میرے نزدیک سرخ اونٹوں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اگر کوئی اس قسم کا معاہدہ کرنے کے لئے مجھے دعوت دے تو میں اس میں شامل ہوں گا۔ ۲

ان باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ زندگی کے ابتدائی دور ہی میں آنحضرتؐ کو اللہ نے سیاسی بصیرت سے بہرہ مند فرمایا تھا اور اس دور کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے سیاسی مسائل سے آپؐ خوب آگاہ تھے۔

تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرتؐ کا سیاسی کردار ہر اعتبار سے عدیم المثال اور ہر لحاظ سے بے نظیر تھا۔ دورِ جاہلیت میں حضورؐ کی زندگی اس عہد کی پوری دنیا کے تمدنی معاملات کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ پوری قوم نے آپؐ کو "امین" اور "صادق" کے بلند ترین خطابات کا مستحق قرار دیا۔ اور پھر عرب کی انتہائی معزز و محترم خاتون خدیجۃ الکبریٰؓ نے اپنے اقتصادی و تجارتی معاملات میں آپؐ پر کلی اعتماد کیا اور آپؐ کی بے پناہ خصوصیات کی بنا پر حبالۂ عقد میں آئیں۔ اس وقت آپؐ کی عمر پچیس سال کی تھی۔

آنحضرتؐ عمر مبارک کے پینتیس ویں سال میں تھے کہ جب قریش میں خانۂ کعبہ کی نئی تعمیر کے موقع پر حجرِ اسود کو نصب کرنے کا مسئلہ پیش آیا اور مختلف قبائلِ عرب میں نزاع کی صورت ابھر آئی۔ یہ نہایت نازک وقت تھا۔ اس وقت سب نے متفقہ طور پر آنحضرتؐ کو اپنا منصف مقرر کیا۔ آپؐ نے پتھر کو چادر میں رکھا اور پھر تمام قبائل کے سرکردہ افراد کو چادر اوپر اٹھانے کا

حکم دیا۔ جب چادر حجرِ اسود کے نصب ہونے کے مقام تک پہنچا دی گئی تو آپؐ نے اس میں سے اپنے دستِ مبارک سے پتھر اٹھایا اور اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ یہ آنحضرتؐ کا وہ بہت بڑا سیاسی فیصلہ تھا جس سے عرب قبائل کا اختلاف بالکل ختم ہو گیا۔ اور لڑائی کی جو خوفناک صورت پیدا ہو گئی تھی' چند ثانیوں میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

آپؐ کا عہدِ طفولیت بھی مکہ مکرمہ میں گذرا اور دور جوانی بھی اسی شہر میں بسر ہوا۔ بنو ہاشم کو آپؐ کی ذاتِ گرامی پر فخر تھا۔ کلیسا کے اہلِ علم آپؐ کے مدّاح تھے' احبار یہود آپ کی دیانت و امانت کے معترف تھے اور دوسرے لوگ بھی آپؐ کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ چالیس برس آپؐ نے لوگوں میں بسر کیے۔ اکتالیسویں سال کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرشتے کے ذریعے نبوّت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا اور حکم دیا کہ آپؐ کا بنیادی فرض اسلامی معاشرہ پیدا کرنا اور لوگوں کو برائی کے ارتکاب سے روکنا ہے۔ چنانچہ اللہ کا یہ پیغام ملتے ہی آپؐ نے کمرِ ہمّت باندھی اور لوگوں کو کفر و شرک سے روکنے اور خیر و صلاح سے بہرہ ور کرنے کی مہم شروع کر دی۔

اس راہ میں جہاں بے شمار لوگوں نے آپؐ کا ساتھ دیا۔ وہاں بہت سے افراد نے شدید مخالفت بھی کی۔ آپؐ نے بڑی عزیمت اور انتہائی ہمّت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ امن و سلامتی کی منزل کی طرف بڑھتے رہنا' آپؐ کی زندگی کا نصب العین تھا۔ اور آپؐ برابر اس جانب بڑھتے رہے۔ اس راہ میں جو تکلیفیں آئیں' خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ اور اگر کسی طرف سے آرام پہنچا تو اس پر اللہ کا شکر ادا فرمایا۔ بہت سے سرکردہ لوگوں نے بے حد کوشش کی کہ آپؐ اپنی دعوت سے باز آجائیں اور جو جی چاہے شرطیں منوالیں۔ آپؐ نے دعوت سے دست بردار ہونے کا خیال قطعی طور پر دل سے نکال دیا اور صاف لفظوں میں اعلان فرمایا کہ

> "اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تو بھی میں اپنی اس دعوت سے باز نہیں آؤں گا اور اللہ کے ارشاد کے مطابق جو فیصلہ کر چکا ہوں اس پر ہر صورت میں قائم رہوں گا"۔ ۳۔

"میرے لئے ناممکن ہے کہ ان باتوں کی تبلیغ نہ کروں جو سب سے بہتر ہیں اور ان باتوں کی تردید نہ کروں جن کو اللہ نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے منافی قرار دیا ہے۔"

آنحضرتؐ نے وطن سے نکل جانا اور ہجرت کر کے دوسرے علاقے میں چلے جانا منظور فرمایا لیکن اپنے مقصد و موقف سے ذرّہ بھر ادھر ادھر ہونا گوارا نہیں کیا۔ سب سے پہلے آپؐ نے

اپنے صحابہؓ کو حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کی اجازت دی۔ اس ہجرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ کے لئے سیاسی وسعت کے نئے دروازے کھلے۔ اور اسلام کی دعوت وطن کے محدود دائرے سے نکل کر دنیا کے دوسرے حصّوں میں پہنچی۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی صدائے دلنواز اس اسلوب سے گونجی کہ بڑے بڑے دماغ اس سے متأثر ہوئے۔ پھر بھری محفل میں اسلامی اور غیر اسلامی نظام کا اس انداز سے مقابلہ ہوا کہ صداقت کو فتح حاصل ہوئی اور اس دور کی ایک بہت بڑی طاقت آنحضرتؐ کی ہم نوا و ہم خیال ہو گئی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد آپؐ نے اپنے فرماں برداروں کے نام مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کا فرمان جاری کیا اور خود بھی مکّہ کی سکونت ترک کر کے مدینہ میں اقامت گزیں ہوگئے۔ یہ بہت بڑا اقدام تھا جو آپؐ نے کیا۔ اس کے بعد آپؐ کی سیاسی قوّت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا اور اسلامی نظام تمام دنیا میں متعارف ہو گیا۔ ۴؎

مدینہ شریف جانے کے بعد کفر کی طاقتوں اور غیر اسلامی نظاموں سے آنحضرتؐ کی شدید معرکہ آرائی ہوئی' بار ہا لڑائی کا بازار گرم ہوا۔ اور فریقین کے درمیان سخت مقابلے ہوئے۔ بالآخر کفر کا بازو ٹوٹ گیا اور اسلامی نظامِ سیاست کامیابی سے ہم کنار ہوا۔ پھر مدینہ میں آنحضرتؐ نے ایک ایسی حکومت قائم کی' جس کی دنیا میں نہ پہلے کوئی مثال ملتی تھی' نہ بعد میں کسی نے اس کی کوئی نظیر دیکھی۔ آنحضرتؐ اس حکومت کے صدر بھی تھے اور امیر بھی' اس کی فوجوں کے کماندار بھی تھے اور سپاہی بھی' اس کی عدلیہ کے بہت بڑے منصف بھی تھے اور اس کے شعبہ اقتصادیات کے ماہر بھی' اس کے حاکم اعلیٰ بھی تھے اور معاشیات اور تجارت کی گتھیاں سلجھانے والے بھی۔ اب سرورِ کائناتؐ کی حیثیت دنیا کے عظیم الشّان سیاست دان اور بہت بڑے حاکم کی تھی۔

آپؐ نے مملکتِ اسلامی میں جو قوانین نافذ کئے' اس کے لئے جو اصول وضع فرمائے' جو احکام جاری کئے' اور لوگوں کو جو ہدایات دیں اور جس توازن و اعتدال سے اپنے سیاسی معاملات کو چلایا' وہ سب فطرتِ انسانی کے عین مطابق تھا' یہی وجہ ہے کہ جس چھوٹے بڑے نے اس پر اچھی طرح غور کیا' اسے پوری طرح اپنا لیا۔

آنحضرتؐ نے اسلامی حکومت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جو اصلاحات کیں اور اس نظام کو جن خطوط پر چلانے کی طرح ڈالی' وہ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہے:

○ —— حکومت کو بے مقصد نمائشوں اور غلط قسم کی سرمایہ دارانہ آلائشوں سے پاک کر کے اس

میں حقیقت پسندانہ اور صحت مندانہ نظام عدل قائم کیا اور دائرۂ حکومت میں عوام کے اختیار کو داخل کرنے کے مواقع فراہم کیے۔

○ ---- شہنشاہیت کے مروّجہ نظریے کو کاروبارِ حکومت سے خارج کر کے اس کی جگہ عوامی سادگی کو رواج دیا' اس سے تاج و تخت' قصور و محلّات' حاجب و دربان اور خدّام و حشم کے پر تکلف سلسلے ختم ہوئے اور اس سے بڑی بڑی تنخواہوں والے حکّام اور رشوت خور عمّال کا خاتمہ ہوا جن کی وجہ سے حکمران تک عوام کی رسائی کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔

○ ---- انصاف کا حصول نہایت آسان ہو گیا۔ طاقتوروں کا غرور ٹوٹا اور کمزور کی گردن اونچی ہوئی۔ صداقت کا معیار محض پیسہ نہ رہا۔ اس باب میں امیر اور غریب کی تفریق قطعاً" ختم ہو گئی۔

○ ---- انسانی حقوق میں مساوات کا عمل جاری ہوا۔

○ ---- دولت کی تقسیم کا ایسا نظام قائم کیا گیا کہ نہ سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر سکے اور نہ روز بروز غریب کی غربت بڑھتی رہے۔

○ ---- مدینہ کو دارالسّلطنت بنا کر ملک میں کئی انتظامی حلقے قائم کر دیئے۔

○ ---- حکومت میں شوریٰ کو بنیادی اہمیت دی اور قرآن نے حکم جاری کیا کہ تمام اہم امور باہمی مشورے سے طے کئے جائیں۔ اور عوام کو حکومتی معاملات میں باقاعدہ شریک کیا جائے۔

○ ---- فوجوں کو منظم کیا' ملک کی دفاعی حیثیت مضبوط کی اور الگ الگ فوجی یونٹوں کے کماندار مقرر کئے۔

○ ---- فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ انسانی جان کی قدر کی جائے' کسی پر ظلم نہ کیا جائے اور انسان سے انسان کی سطح پر برتاؤ کیا جائے۔

○ ---- بین الاقوامی معاملات کو درست رکھنے کے لئے آنحضرتؐ نے مختلف ملکوں کے ملوک و سلاطین سے خط و کتابت کی اور قبیلوں اور ریاستوں کے حکمرانوں کو خدا کے نام پر جمع ہونے کی دعوت دی۔

مختصر یہ کہ حکومت و سلطنت کے تمام معاملات سے متعلق آنحضرتؐ نے احکام جاری کئے اور ہر شعبے کو منظم و مستحکم کرنے کے لئے نہایت عمدہ اور قابلِ عمل اصول وضع کئے۔

یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی زندگی کے چند گوشے ہیں جو کتب سیرت میں نہایت ابھرے ہوئے الفاظ میں مرقوم ہیں۔ آنحضرتؐ نے ۱۱ھ میں وفات پائی۔ اس وقت

اسلام کی بلند کردار فوج کے نوجوان کمانڈر اسامہؓ کا رخ ملک شام کی طرف تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ آنحضرتؐ کے بعد اسلامی حکومت خلافتِ راشدہ اور عوامی ریاست کی حیثیت سے دنیا میں ابھرے گی۔ اور اس کی وساطت سے فلاح و بہبود کا عالم گیر نظام قائم ہو گا۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسی سیاست و تنظیم عمل میں آئی کہ سطحِ ارض پر جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ وہ اسلامی حکومت تھی جس کی بنیاد عصرِ نبوت میں پڑ گئی تھی۔

۱۔ البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۸۳

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۹۲

۳۔ سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۱۷۰

۴۔ تاریخ الکامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۲۴

بقیہ: تحریک اسلامی کے اخلاقی تقاضے

حصے میں آتے ہیں اور جس درجہ میں کسی تحریک کے کارکن مرغوباتِ نفس یعنی اسبابِ انحطاط و اضمحلال سے لپٹے رہ جاتے ہیں اسی درجے میں دنیا میں خوش آئند نتائج اور آخرت میں مالک کی رضا کا حصول دور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

بقیہ: مغربی تہذیب کی ترقی

تھی۔ غلط طور پر اس کامیابی اور چمک دمک کا انتساب اس کے بنیادی تصورات سے جوڑ دیا گیا ورنہ بنیادی تصورات کے متعلق تو حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ' ناپائیدار ہوگا

بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر نومبر' دسمبر کا شمارہ اکٹھا شائع کیا جا رہا ہے۔

تحریکِ اسلامی کے اخلاقی تقاضے

(آخری قسط)

جناب سید اسعد گیلانی

کاروبار و تجارت

تجارت اور کاروبار تو موجودہ دورِ معاشیات میں اس راستے کی بہت ہی بڑی چٹان ہے اگر یہ چیزیں تحریک کو مالی تقویت پہنچانے میں مددگار ہوں تب تو ان کی افادیت مسلّم ہے لیکن اگر یہ راہِ حق میں قدم اٹھانے میں پاؤں کی بیڑی بن جائیں اور انسان اس میں دفن ہو کر اس طرح اس کا غلام ہو جائے جس طرح مردہ قبر میں دفن ہو کر اس کا پابند ہو جاتا ہے تو پھر یہ راہ حق کا ایک ایسا پھندا ہے جسے زندگی میں اس کی حیثیت کے مطابق محدود اور قابو رکھنا مردِ مومن کا فرض بن جاتا ہے۔ یہ بھی آخرت فراموشی کا ہی ایک پہلو ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے معاملات میں گردن تک دھنسا ہوا اپنے سارے فرائض اور دوسروں کے سارے حقوق سب کچھ بھول جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے لیکن حاضر و موجود میں مبتلا انسان غائب و غیر محسوس آخرت کا ادراک و احساس کرنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

"تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔"

چنانچہ کاروبارِ دنیا کی مرغوبیت پر تبصرہ کرتے ہوئے خود قرآن نے فرمایا:

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، گھوڑے مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئیں ہیں تو یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ اللہ ہی کے پاس ہے"۔ (آل عمران۔ ۱۴)

اب یہاں کاروبارِ دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے چند مزید اسباب و عوامل کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں پہلی چار چیزوں کے علاوہ دو چیزوں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔

مویشی (دودھ والے، سواری والے اور زمینیں جوتنے والے جانور)

زرعی زمینیں (فصلیں، باغات، ٹیوب ویل اور متعلقہ ساز و سامان)

ظاہر ہے کہ مویشیوں کے اوقاتِ کارکردگی کے ساتھ بندھا ہوا مجبور و پریشان انسان اور زمینوں کی فصلوں کا سخت پابند آدمی کسی انقلابی تحریک کے ساتھ کیا انقلابی کارنامے سرانجام دے سکتا ہے جب تک اس کا انقلابی جذبہ ان چیزوں کو اس کے اصول و نظریے کا پابند نہ بنائے اور

ان کاموں کے پروگراموں کو اپنے تحریکی پروگراموں کے تحت نہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے کام کے لیے بھی اپنے بندوں سے اس کاروبار اور تجارت کی اصطلاح میں ہی بات کی ہے فرمایا گیا:

"اے مسلمانو! کیا میں تمہیں ایسی سوداگری بتاؤں جو تمہیں آخرت میں عذاب سے بچا لے اور وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو اگر تم سمجھتے ہو تو یہ تجارت تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

(الصف - ۱۰، ۱۱)

چنانچہ حضور اکرمؐ کی تحریک کے لوگوں نے اللہ کے ساتھ ایسی ہی تجارت کی اور اس تجارت کی انتہائی درخشاں مثالیں پیش کیں اس لئے وہ تھوڑے وقت میں بہت بڑا انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضور اکرمؐ نے خود اپنے جمے جمائے، پھیلے پھیلائے، وسیع کاروبار کو تحریک کی ضروریات کی خاطر اللہ کی راہ میں بالکل بیٹھ جانے دیا اور اپنی ساری مساعی کا محور و مرکز صرف اللہ کے دین کی سربلندی کو ہی قرار دے لیا۔ یہی حال ان کے دوسرے ساتھیوں کا ہوا۔ جو لوگ مکّہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے کاروبار اپنے ساتھ تو نہیں لے گئے تھے۔ انہوں نے اسلامی تحریک کے لیے قربانی کی ایسی اجتماعی مثال پیش کی جس کا نمونہ تاریخ میں دوسرا کوئی نہیں ملتا۔

حضرت صہیب رومیؓ مکہ میں بہت بڑے تاجر اور کاروباری تھے۔ جب وہ ہجرت کے لیے اپنا سروسامان لے کر شہر سے باہر نکلے تو قریش مکّہ نے پکڑ لیا اور کہا کہ یہاں جب تم ہمارے شہر میں آئے تھے تو خالی ہاتھ آئے تھے۔ تم نے ہمارے ہی شہر میں کاروبار اور تجارت کر کے اتنا اثاثہ بنا لیا، اب اسے کہاں لیے جاتے ہو۔ حضرت صہیب رومیؓ نے اپنا سب کچھ ان کے حوالے کیا اور تہی دست ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ مدینہ میں پہنچے تو حضور اکرمؐ تک صحابہؓ نے صہیبؓ کے یوں لٹ پٹ کر خالی ہاتھ پہنچنے کی خبر سنائی۔ حضورؐ نے صہیبؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا "صہیبؓ تم نے اپنے رب کے ساتھ بہت اچھا سودا کیا، مبارک ہو!"

یہ بات کہنے والے بھی جانتے تھے اور سننے والے بھی کہ واقعی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اتنا بڑا محفوظ سودا ہے جس کے نفع کی کوئی انتہا نہیں ہے بس اس کے لیے خلوص اور انتظار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے وہ کئی گنا ہو کر اس وقت واپس ملے گا جب اسے اس کی سب سے

زیادہ ضرورت ہو گی ساتھ ہی اسے مزید اپنے رب کی خوشنودی ملے گی جو انمول ہے اور جس کا کوئی شے بھی بدل نہیں ہے۔

اسی طرح بعد میں بھی جن لوگوں نے اسلامی تحریک کا کام کیا انہوں نے اپنے کاروبار اور تجارت کو اس راہ میں قربان کیا۔ تحریکِ مجاہدین سے وابستہ ہزاروں مجاہدین اپنے کاروبار چھوڑ کر تحریک میں شامل ہوئے اور سرحد میں جا کر محاذِ جنگ پر شہید ہوئے۔ ہزاروں لوگ کاروبار سے کئی کئی ماہ تک غیر حاضر رہتے' محاذ پر جا کر لوگوں میں شامل ہوتے اور پھر واپس آکر اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے تاکہ تحریک کو مالی امداد بھی پہنچائی جا سکے۔ جو لوگ تحریک سے مالی تعاون کرتے رہے ان کی جائیدادیں اور کاروبار کافر حکومت نے ضبط کیے اور انہوں نے ہنسی خوشی یہ قربانیاں گوارا کیں تاکہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کو خوش کر سکیں۔ وہی ہر شے کا مالک ہے اور ہر شے اسی کی طرف سے ہے۔

پر تکلّف رہائش گاہیں

گھربار اور پر تکلّف رہائش گاہیں بھی انسان کے لیے اسلامی تحریک کے راستے کا پھندا بن جاتی ہیں۔ انسان کے لئے اپنے آباد گھروں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اپنے معمولات کو چھوڑنا اور غیر معمولی حالات سے دو چار ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے گھروں سے باہر کی دشواریاں اور تکالیف اور دیگر مشکلات برداشت کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اپنے معمول کے کھانے' معمول کے بستر' معمول کے کام کاج' چاروں طرف اپنے بیوی بچوں اور عزیزوں کے پر محبت چہرے اور ان کی قربت اور رہائش آخر کسے پسند نہیں ہے۔ لیکن اللہ کے دین کا مطالبہ تو یہی ہے کہ جب اسلامی تحریک کا پروگرام سامنے آئے تو ان مرغوباتِ نفس کو قربان کر کے راہِ حق میں نکلا جائے۔ جس درجے میں کوئی شخص ان چیزوں کے گھیراؤ میں زیادہ پھنسا ہوا ہو گا اسی قدر وہ بوجھل ہو گا اور جس قدر اس کے گرد ان چیزوں کا گھیرا کم ہو گا اسی درجے میں وہ ہلکا ہو گا۔ لیکن اللہ کا دین جب غالب نہ ہو تو اس کا مطالبہ یہی ہے کہ دین کی سربلندی کے لیے اسلامی تحریک کی جدّوجہد کے لیے نکلو۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ "نکلو اللہ کی راہ میں ہلکے ہو یا بھاری۔" (توبہ)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیفیتِ قلب کو خوب جانتے ہیں اور ان کے مرغوبات سے بھی خوب آگاہ ہیں' اس لیے کہ وہ خالقِ فطرت ہیں۔ چنانچہ دین کے لیے جدّوجہد کرنے والے

مجاہدین سے ان مرغوبات کی قربانی طلب کر کے پھر آخرت میں ان سے لاکھوں گنا بہتر مرغوبات کا وعدہ بھی بار بار کیا گیا ہے۔ گویا ان تمام مرغوبات کو مستقل' پائیدار اور کامل صورت میں پا لینے اور حقیقی طور پر ان سے متمتع ہونے کا مقام دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے جہاں یہ سب چیزیں بہترین طور پر دینے کا وعدہ مضبوط اور پختہ ہے اور پھر جنہیں چھوڑنے کا دوبارہ مطالبہ نہ کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں بھی اسلامی تحریک سے وابستہ لوگوں نے بہت درخشاں مثالیں پیش کی ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو وہ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دعوت دین کی خاطر دیس دیس کی خاک چھانتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آیا تو انہوں نے بھی ساری عمر مسافرت اور صحرا نوردی میں ہی گذار دی۔ اور جب حضور اکرمؐ کی مثالی اسلامی تحریک کے سامنے آیا تو انہوں نے اپنے بھرے ہوئے گھر' چلتے ہوئے کاروبار اور آباد گھرانے چھوڑ کر خالی ہاتھ پر دیس کا راستہ اختیار کیا اور کسی کی پر آسائش رہائش گاہیں بھی ان کا رستہ نہ روک سکیں۔ اسی طرح مجاہدین کی تحریک میں ہزاروں لوگوں نے اپنے گھربار چھوڑے اور پردیس میں نکل گئے اور اس طرح نکلے کہ بظاہر انہیں دوبارہ ان گھروں میں واپس آنے کی کوئی امید نہ تھی اس لیے کہ انہیں حتمی ایمان حاصل تھا کہ

"اللہ کے ہاں تو انہیں لوگوں کا بڑا درجہ ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھربار چھوڑے اور جانفشانیاں کیں۔ بس وہی کامیاب ہیں" (توبہ۔ آیت ۲۰)

مزید فرمایا گیا:

"جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ایمان لانے کی وجہ سے ستائے گئے تو انہوں نے گھربار چھوڑ دیے' ہجرت کی' راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا۔ ان کے لیے یقیناً تیرا رب غفور الرحیم ہے" (النمل)

غرض گھروں سے نکلنے اور راہ حق میں جدوجہد کی مثالیں اسلامی تحریک کی تاریخ میں ہر دور میں موجود ہیں اور پھر جس قدر درخشاں مثالیں کسی تحریک نے پیش کی ہیں اسی قدر خوش آئند اور پائیدار نتائج اس کے کام کے برآمد ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو ان کی مرغوبات نفس کے ذریعے اپنے دین کی خاطر آزماتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ ان مرغوبات کے مقابلے میں اللہ کے دین کے کام کو کس درجہ ترجیح دیتے ہیں۔ پھر جس درجے میں کوئی تحریک ایثار و قربانی کے اس میدان میں عمدہ اور کثیر مثالیں پیش کرتی ہے اسی درجے میں درخشاں اور خوب تر نتائج اس کے

ما بقیہ بر صفحہ ۷۰

مغربی تہذیب کی ترقی
اساسی تصورات کی بنیاد پر نہیں ہوئی

جناب پروفیسر سید محمد سلیم

آغاز سے، حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے ہدایت بھیجی۔ مختلف زمانوں میں اور مختلف ملکوں میں انبیاء کرام آئے۔ اور ایک ہی ہدایت کی تعلیم دیتے رہے۔ مکمل صورت میں آج وہ ہدایت اسلام کے پاس موجود ہے۔

اسلام کے اساسی تصوّرات

انسان صاحب عقل و فہم ہستی ہے۔ اس کے یہاں پہلے فکر ہے پھر عمل ہے۔ انسان پہلے کوئی نہ کوئی خیال یا تصور قائم کرتا ہے پھر اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ فکر، عمل سے مقدم ہے۔ جس طرح تعمیر مکان کے لئے بنیادیں ضروری ہیں، اسی طرح اجتماعی، معاشرتی اور تمدنی زندگی گزارنے کے لئے کچھ مستحکم افکار و تصودات ضروری ہیں خواہ وہ دوسروں کی نظر میں بچکانہ ہوں یا فلسفیانہ۔ یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اسلام نے بھی زندگی بسر کرنے کے لئے بنیادی افکار و تصورات یعنی عقائد دیے ہیں:

۱۔ کائنات ---- زمین و آسمان ---- کا خالق و مالک، حکیم اور مدبّر اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ہر وقت اس کی غور و پرداخت اور نگرانی کرتا رہتا ہے۔

۲۔ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور خلیفہ ہے۔ اس کی عطا کردہ آزادی کے تحت بڑی حد تک آزاد اور خود مختار زندگی گزارتا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و فہم سے اور خود شعوری کی نعمت سے نوازا ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لئے آسمان سے ہدایت بھیجی ہے۔ سیدھے راستے کی ہدایت بخشی ہے۔ انسان کو مختلف ذہنی، فکری اور جسمانی صلاحیتوں اور استعدادوں سے نوازا ہے۔

۴۔ زمین پر انسان کے لئے انواع و اقسام کی نعمتوں کا وسیع دستر خوان بچھا دیا ہے۔ انسان کی تمام احتیاجات فراہم کیں۔ انسان دراصل زمین پر اشرف المخلوقات ہے۔

۵۔ انسان کی زندگی درحقیقت ایک امتحان ہے، ایک آزمائش ہے۔ اس کی صلاحیتوں کا اور ان نعمتوں کا امتحان ہے کہ وہ حسنِ اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے یا بداعمالی کا، خیر کی دولت کماتا ہے یا بدی۔ اطاعت و فرماں برداری اختیار کرتا ہے یا نافرمانی اور سرکشی۔

۶۔ مرنے کے بعد آخرت میں اس امتحان کا نتیجہ ظاہر کیا جائے گا۔ وہ کامیاب یا ناکام قرار دیا جائے گا۔

ان تصورات کے تحت اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار بندوں کی ساری زندگی عبادت ہے۔ ساری زمین ان کے لئے مسجد کا حکم رکھتی ہے۔ سارے شعبہ ہائے حیات میں اساسی تصورات جاری و ساری ہوتے ہیں۔ اسلام کے نظامِ تعلیم کے اندر خواہ کوئی سا شعبہ ہو یہ اساسی تصورات جاری و ساری ہوئے۔ ماضی کی تمام تہذیبوں میں یہ بنیادی تصورات کم و بیش جاری رہے ہیں۔

مغربی تہذیب کے اساسی تصوّرات

چار صدی قبل یورپ میں پوپ اور کیتھولک مذہب سے عوام کی جنگ ہو گئی۔ اس کے بعد یورپ میں نشاۃ ثانیہ Renaissance کا آغاز ہوا۔ اس وقت مغربی تہذیب کے اساسی تصورات تشکیل پائے۔ یہ تصورات اہل مذہب کے خلاف ردِّعمل کے طور پر پروان چڑھے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ اہل یورپ نے فکری محاذ پر خدا' آخرت اور مذہب کا انکار کر دیا۔

۲۔ انہوں نے مذہبی عقائد' مذہبی اقدار اور مذہبی رسومات کا انکار کر دیا۔

۳۔ اہل یورپ نے قدیم انبیاء کی لائی ہوئی تعلیمات کا یکسر انکار کر دیا۔

یہ تمام نفرت اور حقارت کی منفی بنیادیں ہیں۔ مثبت بنیادوں کے طور پر

۴۔ اہل یورپ نے مادی اور محسوس دنیا کے ماورئی ہر شے کا انکار کر دیا۔

۵۔ انہوں نے کہا کہ انسان ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے۔ انسان کے اوپر کوئی بالاتر ہستی نہیں ہے جس کے سامنے وہ جواب دہ ہو۔

۶۔ ہدایت اور رہنمائی کے لئے انسان کی عقل کافی ہے۔ کوئی آسمانی ہدایت نہیں۔ اس طرح یورپ کے انسان نے دینی' اخلاقی' فکری اور معاشرتی ہر قسم کی پابندی سے خود کو آزاد کر لیا۔ فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندہ کی طرح وہ زمین میں آزادانہ گھومنے پھرنے لگا۔

مادر پدر آزاد یورپ کی ترقی اور علوم و فنون کا فروغ

صدیوں سے کیتھولک مذہب اور خاص طور پر مسلکِ رہبانیت نے یورپ میں انسانی صلاحیتِ کار کو محبوس اور مقید کر رکھا تھا۔ ہمہ جہت پابندیوں کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں بیکار پڑی تھیں۔ ان کو زنگ لگ رہا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کی آزادی کے بعد افراد کو بے محابا آزادی حاصل ہو گئی۔بند پھٹ پڑا۔ ایک سیلاب بہہ نکلا۔ محبوس صلاحیتوں نے مختلف میدانوں میں جولانئ طبع کا

مظاہرہ کیا۔ زقندیں بھریں۔ چوکڑیاں دکھائیں۔ یورپ کا انسان نئے جوش' نئے ولولے اور نئی امنگوں کے ساتھ میدان عمل میں گام زن ہوگیا۔

سیاحت اور ملاحت کے میدان میں یورپ کا انسان دور دراز خطوں میں جا پہنچا۔ نئے نئے ممالک اور نئے نئے جزائر دریافت کیے۔ نئی نئی اشیاء اور اجناس سے واقف ہوا۔ آلو' ٹماٹر' مکئی وغیرہ اجناس کو امریکہ سے لاکر یورپ میں پھیلا دیا۔ غذائی قلت کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس کے بعد یورپ کی آبادی یکلخت بڑھتی چلی گئی۔

یورپ کے انسان نے امریکہ اور افریقہ کے ممالک پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کے باشندوں کو جانوروں کی طرح غلام بنا کر دور دراز خطوں میں لیجا کر فروخت کر دیا۔ نو دریافت ملکوں اور جزیروں میں ان غلاموں سے کاشت کرائی۔ اس طرح محنت اور مزدوری کا مسئلہ حل کر دیا۔ ان کی محنت سے خوب خوب دولت کمائی۔

یورپ کے انسان نے ایشیاء اور افریقہ کے متمدن ملکوں پر قبضہ جمایا۔ وہاں کے انسانوں کا خوب خوب استحصال کیا۔ وہاں سے بے اندازہ دولت سمیٹ کر اپنے ملکوں کے خزانے بھرلئے۔ ان کے ملکوں میں گھر گھر میں دولت کی بارش ہونے لگی۔ عیش اور فراوانی ہوگئی۔ فراغت اور یک سوئی حاصل ہوگئی۔

فکری فراغت اور یک سوئی کے نتیجے میں ایجادات' اختراعات ہونے لگیں۔ صنعت و حرفت اور فنی مہارت میں خوب ترقی ہوئی۔ ضرورت کے تحت مشینیں ایجاد ہوئیں۔ پہلے گاؤں اور بستی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے چھوٹے کارخانے اور چھوٹے کرگھے درکار تھے۔ نئے حالات کا تقاضا کثیر پیدا آوری تھا۔ اب بڑے بڑے کارخانے لگائے گئے۔ مشینیں دن رات چلنے لگیں۔ فاضل پیداوار کی کھپت کے لئے پھر ایشیاء' افریقہ اور جزائر کی منڈیوں پر قبضہ جما لیا۔ بقول علامہ اقبالؒ ۔

اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

اس طرح چشم فلک نے یہ منظر دیکھا کہ ساری دنیا کے انسان اہلِ یورپ کے غلام اور خدمت گار بن گئے۔ ساری دنیا کے زر و جواہر کے ڈھیر اہلِ یورپ کے قدموں پر جمع کر دیئے گئے۔

یورپ کی ترقی کا اصل راز

یورپ میں جب دولت کی فراوانی ہوئی' معاشرہ میں استحکام اور تمدنی ترقی ہوئی تو یہ درحقیقت ایشیاء اور افریقہ کے ممالک کی لوٹ کھسوٹ کے بعد ہوا۔ قدیم متمدن ممالک میں افلاس اور

معاشرتی عدم استحکام پیدا کرنے کے بعد ہوا۔ حکومتیں ان کی ختم کردیں۔ دولت ان کی سمیٹ لی۔ تہذیبی اور تمدنی ادارے ان کے تباہ و برباد کردیئے۔ ذہنی غلامی میں مبتلا کردیا۔ پرانے عقائد میں تزلزل پیدا کردیا۔ فکری اور اخلاقی انتشار و اختلال کو پروان چڑھایا۔ اس دور میں مغربی تہذیب کی برتری اور کامیابی کا تصور عام ہوگیا۔ صدیوں سے انفرادی خوشحالی' ذہنی و فکری ٹھہراؤ اور معاشرتی اور تمدنی استحکام کے باعث ان ممالک میں عمومی سطح پر سلیقہ' قرینہ' شائستگی اور انفرادی احترام نظر آتا ہے۔ وہ ان صفات کا رشتہ مغربی تہذیب کے اساسی تصورات سے جوڑ دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کا رابطہ تین صدیوں کی خوشحالی اور تمدنی استحکام سے ہے جو اہل مشرق کی لوٹ کھسوٹ کے بعد قائم ہوا ہے۔

اس دور میں مشرقی ممالک اور مشرقی تہذیبوں کی خواری اور زبوں حالی کا تصور بھی عام ہوگیا۔ افلاس' ناچاقی' جھگڑے' ٹوٹی سڑکیں' تعلیم کی تباہی وغیرہ مناظر یہاں عام نظر آتے ہیں۔ ان صفات کا رشتہ مشرق کی تہذیب کے اساسی تصورات سے جوڑ دیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جن تین صدیوں میں یورپ نے عروج و ترقی حاصل کی ٹھیک اس زمانہ میں ایشیاء اور افریقہ کے ممالک زوال' فساد اور خواری سے ہم کنار ہوئے

؎ اے صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست

آج آزادی کے بعد بھی اہل مغرب کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں بدستور جاری ہیں۔ کسی ملک کو آرام و سکون سے رہنے نہیں دیا جاتا۔ اول تو اہل نظر بہت کم یاب ہوتے ہیں۔ پھر جدید تعلیم میں سائنس کے طلبہ کا غلبہ ہے۔ تاریخ سے عدم واقفیت ہے۔ حالانکہ ان تغیرات کی حقیقت تاریخ کے میدان ہی میں معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ان تاریخی حقائق پر لوگوں کی نظریں کم ہی جاتی ہیں۔

حالانکہ اصل حقیقت بس اس قدر ہے کہ یورپ کے انسان نے مذہب سے لڑ کر بے محابا آزادی حاصل کرلی۔ مادر پدر آزادی حاصل کرلی۔ اس کا مستحسن پہلو یہ نکلا کہ مختلف معاشرتی میدانوں میں جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا۔ غیر معمولی محنت و مشقت کی۔ پوپ کو شکست دینے کے بعد ایک نیا ولولہ' ایک نئی سرشاری کیفیت سے اہل یورپ دو چار تھے جس کے نشہ میں پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ سمندر کی تہہ میں گھس گئے۔ محنت و مشقت کا صلہ ملا۔ علوم و فنون میں تفوق حاصل ہوا۔ نئی اختراعات' ایجادات اور انکشافات ہر قوم میں آئے۔ فکری اور عملی محاذ پر غلبہ حاصل کرلیا۔ ساری دنیا ان کی تابع بن گئی۔

اہل یورپ کی فکری جولانیوں پر ایک نظر ڈالئے۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ یہ افکار مذہب سے نفرت کی پیداوار ہیں۔ نفرت کے جذبے میں بڑھنے اور پھیلنے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ افکارِ عالیہ نفرت کے پھیلتے ہوئے دائرے ہیں۔ ان کے پس پشت نہ ٹھوس سائنسی حقائق ہیں اور نہ منطقی دلائل ہیں۔ جذبۂ نفرت نے نیم سائنسی فکر کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہ مقابلہ ایسا تھا جیسے ایک طرف گاما پہلوان کھڑا ہو اور دوسری طرف ناتواں مجنوں۔ اس کشتی کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے۔ اس طرح خواہ گورنمنٹ کالج ہو' خواہ اسلامیہ کالج ہو' الحادی رو بدستور آگے بڑھتی رہی۔ بدستور نوخیز نوجوانوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی رہی۔ اور مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں انتشار و اختلال پیدا کرتی رہی۔ سال بہ سال یک سوئی سے محروم پراگندہ ذہن اور پراگندہ دل طلبہ کی کھیپ ان کالجوں سے نکلتی رہی اور اسلامی معاشرہ کے دینی مزاج اور دینی رنگ کو ہلکے سے ہلکا بناتی رہی۔

اساسی تصورات کی ناکامی

جب کوئی تہذیب عروج پر' نصف النہار پر ہوتی ہے' تو اس کی خامیاں اور کوتاہیاں مخفی رہتی ہیں۔ عمرانی اور تمدنی دنیا میں غلطیاں صدیوں کے بعد ظاہر ہوتی ہیں۔ آج مغربی تہذیب کا سورج ڈھلنے لگا ہے۔ آج وہ خامیاں ہر چشم بینا کو نظر آرہی ہیں۔ اس الحادی تہذیب کی کوکھ سے سب سے پہلے نو آبادیاتی نظام پیدا ہوا جس کے مظالم کے سامنے تاتاری مظالم بھی ہیچ ہیں۔ اس لئے وہ ناکام ہوا۔ پھر اس نے سرمایہ داری نظام کو جنم دیا۔ اس نے بھی بے محابا لوٹ مار مچائی۔ بہرکیف وہ بھی ناکام ہوا۔ اس کے علاج کے طور پر اشتراکی نظام بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ میدان میں آیا۔ اور دھاڑتا رہا۔ اس کی گونج ساری دنیا میں سنی جاتی تھی۔ پون صدی بھیانک مظالم کرنے کے بعد وہ بھی ناکام ہو گیا۔ وطن پرستی اور قوم پرستی یورپ میں پیدا ہوئی۔ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آج وہ بھی ناکام ہے۔ آج وہ خود ہی اس کو فنا کر رہے ہیں نسل پرستی جنوبی افریقہ کے سفید فاموں میں ناکام ہوگئی۔ آج مغربی تہذیب کے فکری ستون یکے بعد دیگرے گرتے جا رہے ہیں۔ ہر بالغ نظر مفکر مغربی تہذیب کے سانحہ ارتحال کی خبر بد سنا رہا ہے۔ سپنگلر ہو یا سوروکن ہو

فکرِ انساں کی نارسائی کا اک مرقع ہے صحن افرنگی

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی تہذیب کی عام مقبولیت اس کی چمک دمک کے باعث تھی۔ اس کی چمک دمک چند صدیوں کی محبوس صلاحیتوں کے آزادانہ طور پر سرگرم عمل ہو جانے کا ثمرہ

باقی بر صفحہ ۷۰

جماعتِ اسلامی کیا دیتی ہے؟

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم

آج دنیا میں سوا پانچ ارب انسان آباد ہیں۔ ان میں سے آپ کا شمار ملتِ اسلامیہ میں ہے۔ آپ مسلمان ہیں۔ آپ انسان کی عبدیت اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور معبودیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ مسلمان ہونا بہت بڑا شرف ہے اور اعزاز ہے۔

مسلمانوں کی دنیا میں آج ۴۶ آزاد ریاستیں ہیں۔ ان میں سے ترکیہ اور انڈونیشیا نے برملا اپنے لادین ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ باقی ریاستوں نے لادین ہونے کا اعلان تو نہیں کیا ہے لیکن اسلامی ریاست ہونے کا بھی اعلان نہیں کیا ہے۔ انہوں نے صرف یہ کہا ہے "اسلام ہمارا مذہب ہے۔" پاکستان واحد ملک ہے جس نے بذریعہ قانون ساز اسمبلی باقاعدہ اسلامی ریاست ہونے کا اعلان کیا ہے۔ (قرار دادِ مقاصد' ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء)۔ اس لیے پاکستان جیسی اسلامی ریاست کا شہری ہونا بہت بڑا اعزاز ہے۔ اسلامی ریاست کے اندر ادنیٰ خدمت گار بننا مُوجب اجرو ثواب ہے۔ اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ مخلص مسلمانوں کے ہاتھوں عمل میں آسکتا ہے۔ باعمل اور مخلص مسلمانوں کی تیاری کا کام صرف جماعتِ اسلامی انجام دے رہی ہے۔

پاکستان کے اندر جماعت اسلامی واحد جماعت ہے جو نفاذِ اسلام کی داعی ہے' جس نے اپنا مقصد یہ مقرر کیا ہے کہ انفرادی سطح پر افراد کو آمادہ کرے کہ وہ اپنی زندگیاں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں بسر کریں اور اجتماعی سطح پر حکومت کو آمادہ کرے کہ وہ ہر قسم کی کارگزاری اور کاروبار اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور فرماں برداری میں انجام دے۔

دعوت الی اللہ کا یہ وہ عظیم مقصد ہے جس کے لیے انبیاء کرام مبعوث ہوئے تھے۔ آپ ایک ایسی تحریک کے کارکن ہیں۔ یہ تیسرا بڑا شرف اور اعزاز ہے جو آپ کو حاصل ہے۔ اس مجدو شرف کی توثیق قرآن مجید ان الفاظ میں فرماتا ہے:

> "اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔" (حٰم سجدہ۔ ۳۳)

جماعتِ اسلامی اپنے کارکن کی تربیت کرتی ہے' سنوارتی ہے' سدھارتی ہے۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کرتی ہے' اخلاقِ رذیلہ سے دور رکھتی ہے' صلاحیتوں کو ابھارتی ہے' جلابخشتی ہے اور ایک فعال کارکن بناتی ہے۔

سب سے پہلے جماعتِ اسلامی اپنے کارکنوں کے اندر صحیح عقائد' صحیح افکار اور صحیح جذبات

پروان چڑھاتی ہے۔ شرک و کفر' بدعت و فرسودہ رسوم و رواج کے جنگل سے باہر نکالتی ہے۔ آزاد کھلی فضا میں دینِ حنیف کی پیروی کی تلقین کرتی ہے۔ بندۂ رب اور متبع رسولؐ بناتی ہے۔ فروعی اور اختلافی مسائل کے چکر سے باہر نکالتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں عمرِ عزیز کے اوقات ضائع ہونے سے بچاتی ہے۔ حق و باطل میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ اہم اور غیراہم میں فرق کرنا بتاتی ہے۔ باطل کے خلاف دل میں نفرت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ نظام باطل سے مجادلہ کرنے اور احقاق حق کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ ذہنی اور فکری مرعوبیت دور کرتی ہے۔

اسلام کی روشن راہ پر چلنا سکھاتی ہے۔ اس پر زندگی گزارنے کا عزمِ جواں پیدا کرتی ہے۔ حق پرستی کا سرور بخشتی ہے۔ بے مقصد اور لا اوبالی زندگی گزارنے سے بچاتی ہے۔ بامقصد زندگی بسر کرنے پر تیار کرتی ہے۔ نقطۂ نگاہ میں وسعت اور رفعت پیدا کرتی ہے۔ بے غرضانہ جدّوجہد کا ہنر سکھاتی ہے۔

جماعت اسلامی ہر لمحہ مسلمان بن کر زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں کارکنوں کے اندر ہر گوشۂ حیات اور ہر شعبۂ حیات کو دائرہ اسلام میں بسر کرنے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے اور وہ علوم و فنون کے ہر دائرہ میں اسلام کو نافذ اور جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامی ریاست' اسلامی سیاست' اسلامی اقتصادیات' اسلامی بینکنگ' اسلامی قانون' اسلامی تعلیمات میں پیش قدمی ہو رہی ہے۔ کہیں فنِ تدریس کو اسلامی رنگ دیا جارہا ہے۔ کہیں سائنس کو اسلامی قالب عطا کیا جارہا ہے۔ وہ ہر میدان میں' ہر محاذ پر' اور ہر سرگرمی میں مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی نے دین کے مفہوم میں وسعت دے دی۔ اس کو ساری زندگی پر حاوی کر دیا۔

جماعتِ اسلامی اپنے کارکنوں اور وابستگان کی ذہنی' فکری' دینی اور اخلاقی تربیت کرتی ہے۔ اپنا خون جگر جلاتی ہے اور افراد کی تربیت کرتی ہے۔ حق پر ڈٹ جانے کا حوصلہ ان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ باطل سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت اور ہمت بخشتی ہے۔ باطل کی مرعوبیت ختم کر دیتی ہے۔

جماعتِ اسلامی نے دینداری کے مفہوم میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ ہر کام دینی ہے' بشرطیکہ دینی جذبہ سے کیا جائے۔ اور ہر کام بے دینی ہے اگر وہ غلط نیت سے کیا جائے۔ اس کے بعد جماعت کے کارکن دری بچھانے' پوسٹر لگانے سے لے کر ہر قسم کا کام کرتے ہیں' جلسہ آراستہ کرتے ہیں' دعوتی دورے کرتے ہیں' تقریریں کرتے ہیں' مضامین لکھتے ہیں' اشاعت کرتے ہیں'

یہ سب دینداری ہے۔

جماعت کارکنوں کی تربیت کرتی ہے ان کو بولنا سکھاتی ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ علوم کا ذخیرہ ان کو مہیا کرتی ہے۔ وہ بے دھڑک سیاست و ریاست پر گفتگو کرتے ہیں۔ قانون اور دستور کا فرق بیان کرتے ہیں۔ ریاست کے دائرہ کار سے بحث کرتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ زبان جماعت کے لٹریچر نے دی ہے۔ جماعت نے کارکنوں کے اندر نظم' سلیقہ اور ضبطِ اوقات کا طریقہ سکھایا' وقت کی قدر کرنا سکھایا' مقصدی زندگی بسر کرنا سکھایا' خود پرستی کے خول سے باہر نکال کر معاشرہ اور اجتماعیت کی خاطر جدّوجہد کرنا سکھایا' خدمتِ خلق پر آمادہ کیا' بے لوث خادموں کی فوج تیار کر دی۔

جماعتِ اسلامی ذہنیت کو نکھارتی ہے۔ تطہیر افکار کرتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر کرتی ہے۔ عادات و خصائل کی اصلاح کرتی ہے۔ صلاحیتوں کو ابھارتی ہے' جلا بخشتی ہے۔ استعمال سے صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ عدم استعمال سے ان کو زنگ لگ جاتا ہے۔ جماعت اسلامی اپنا خون پسینہ بہاتی ہے' خونِ جگر جلاتی ہے' تب کہیں تعمیرِ شخصیت ہوتی ہے' تب ایک فعال کارکن تیار ہوتا ہے۔

جماعتِ اسلامی نے سکھایا کہ اقامتِ دین کی مہم تن تنہا سر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اجتماعی جدّوجہد اور اجتماعی قوت درکار ہے۔ جماعتِ اسلامی نے اجتماعیت کا سبق دیا۔ اطاعتِ امیر سکھائی۔ نظم کی پابندی سکھائی۔ باہمی مشورہ کا طریقہ سکھایا۔ ساتھ چلنے اور ساتھ لے کر چلنے کی تربیت دی۔ تنقید و محاسبہ کا طریقہ رائج کیا۔ تنقید سننے کا حوصلہ پیدا کیا۔ آج جب کہ ساری دنیا نفس پرستی اور اغراض پرستی میں مبتلا ہے' یہ کارکن اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں۔ حکومت کے اندر بھی رہے اور باہر بھی' ان کے دامن پر دھبہ نہ آیا۔

سب سے آخر لیکن سب سے اوّل اور سب سے اہم' جماعتِ اسلامی کارکنوں کو خلوص و للٰہیّت کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے خلوص اور دلسوزی کی تلقین کرتی ہے۔ تعلق باللہ قائم کرنے پر زور دیتی ہے۔ کوئی شخص یہ ساری کھکھیڑ' یہ تنقید' یہ محاسبہ برداشت نہیں کر سکتا جب تک اخلاص نہ ہو' جب تک تعلق باللہ نہ ہو۔

تحریک کے کارکن کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ یہ کہ وہ عملاً میدانِ کارزار میں موجود ہے۔ باطل افکار اور باطل نظام سے برسرِ پیکار ہے۔ اقامت دین اور قیامِ نظامِ الٰہی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہ عجیب پیکار ہے۔ یہ ذہنی دنیا میں لڑی جاتی ہے۔ یہاں حریف وہ ہی نہیں ہوتے جو

باقی بر صفحہ ۵۶

تفصیلی جائزہ

تاریخِ جماعتِ اسلامی (حصّہ اوّل)

نعیم صدیقی

آباد شاہ پوری صاحب ایک ایسے ادیب و مصنّف ہیں جو نہ صرف شروع سے مولانا مودودیؒ کے ہم سفر ہیں بلکہ مولاناؒ کے نظامِ فکر کے ہر کونے اور زاویے پر ان کی گہری نظر بھی ہے اور جب وہ اس کے متعلق قلم اٹھاتے ہیں تو روشنائی میں ان کے جذبات کی گھلاوٹ خاص رنگ پیدا کردیتی ہے جو کم لوگوں کے ہاں ملتا ہے۔

مگر مؤرخ کو ایک جج کی طرح فریقِ ثانی (یا ثالث و رابع) کے نقطہ ہائے نظر کو بھی سامنے لاکر محاکمہ و جرح کا دو طرفہ کام کرنا ہوتا ہے۔ پس میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مولانا کے خاص محب اور جماعت کے فدائی' یا دوسرے لفظوں میں خود شرکائے جماعت کبھی بھی مؤرخ ہونے کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے۔ مؤرخ اتنا مصلحت بیں نہیں ہوتا کہ وہ بعض احوال و واقعات کو حذف کردے' یا ان کی ضروری تفصیلات کو پردۂ اخفا میں چھوڑ دے' یا خاص خاص معاملات اور نظریات کے متعصب اور غیر متعصب ناقدوں کا ذکر ترک کردے اور ان کے فرمودات کا تجزیہ یا ان کے ذہنی پس منظر کا جائزہ لینے سے کترا کر نکل جائے۔ جماعت کے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ بھڑوں کے بہت سے چھتّوں کو جھاڑیوں اور جھونپڑوں میں مخفی ہی رہنے دیا جائے اور ایک گذشتہ لڑائی کو آئندہ کے لئے از سرِنو نہ اُبھارا جائے۔ اس کی وجہ سے کئی لوگ بگڑ سکتے ہیں لیکن جب بھی کوئی بے رحم مؤرخ جماعت کے باہر سے نمودار ہوگا' وہ تمام واقعات کی جڑیں تک تلاش کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ برادر آباد شاہ پوری کا شاندار کام ہمارے سامنے ایک دلکش کتاب اخلاص و عقیدت کو لایا ہے جس سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز ارکان اور کارکنوں کے عزائم اور تحریکی رجحانات کو مہمیز کرتی ہے۔ اس لحاظ سے میں اس کتاب کا بہت بڑا قدر داں ہوں۔

اس کتاب نے دراصل ہمارے سامنے مولانا مودودیؒ کے خلوص' ان کے فکر' ان کے مطالعہء احوال' ان کے تجزیہ مسائلِ ملّیہ کو' حالات کی خطرناکی اور تعمیری واصلاحی کام کرنے کی بے چینی کو' اور ساتھ ہی ساتھ حالات کی مسلسل ناسازگاری اور اس کے باوجود مولانا کی پُر امید ذہنیت اور سعی و جہد کو نمایاں کیا ہے۔

یہ بات آدمی پہلی دفعہ سمجھتا ہے (اور اس پر کوئی عمل نہیں کرتا) کہ ایک شخص کو قوم کی

سچی خدمت یا کسی تنظیم و تحریک کی قیادت کے لئے کس طرح اور کتنی تیاری کرنی چاہیے۔ آج کا آدمی تو فن تقریر' عوام کی اجتماعی و ہجومی نفسیات اور تھوڑی سی معلومات عامہ (جدید' یا قدیم) کے سامنے وزارت و صدارت کے لئے میدان میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ بلکہ دولت اور جاگیر والے ان پڑھ لوگ پارٹیوں کی صفِ اکابر میں شامل ہوتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم لوگ بھی صرف ووٹ حاصل کرنے کی صلاحیتوں کے ساتھ بڑے طوع و رغبت سے قیادت و امارت کا تاج پہن لیا کریں گے اور گھر سے یہی ارادہ کر کے چلیں گے۔ بعید نہیں کہ بچپن کے خواب ہمارے لئے مکاشفۂ ربانی کے برابر اور قابلیتوں اور صلاحیتوں کی سب سے بڑی سند ہوں۔

مولانا مودودیؒ نے نہ صرف دینی علوم اور مغربی علوم کا کئی برس تک مطالعہ کیا' اپنے لٹریچر میں ان پر بحثیں کیں' بلکہ دوسری طرف اپنے دور کی تمام تحریکوں اور جماعتوں کا بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا اور پھر جس دردمندی کے ساتھ اللہ سے اپنے کربناک احساسات کا اظہار کیا' ناگفتہ بہ حالات کی تصویریں پیش کیں اور اور پھر حل مسائل کے لئے اور نصرت و تائید کے لئے دعائیں کیں' یہ سارا خاکہ آباد شاہ پوری صاحب نے کھینچ کر دکھایا ہے۔ اس خاکے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو معاشرے میں وقار کیوں حاصل ہوا۔ ان میں نوجوانوں کے لئے کشش کہاں سے آئی اور نازک ترین مواقع پر انہوں نے حق کا کس طرح احقاق اور باطل کا ابطال کیا۔

چند آیتیں اور چند سورتیں اور چند اشعار یاد کر کے میدان خطابت کا شہسوار بن جانے والوں کے لئے ادھر ہرگز کوئی کام نہیں ہے۔ وہ اگر آئیں گے تو مولانا مودودیؒ نے ۷۹-۸۷ تک جو کچھ کیا تھا اسے بھی برباد کر کے رکھ دیں گے۔ مولاناؒ کی جگہ کام کرنے کے لئے ایسے لوگ چاہئیں جو برسوں اتنا کچھ پڑھیں جتنا مودودیؒ نے تخلیقی اور تنقیدی رجحان کے ساتھ پڑھا ہے۔ وہ ایسے لوگ ہوں جو ماحول کا اس طرح تجزیہ کر کے دکھائیں جیسا مولانا نے سیاسی کشمکش وغیرہ میں دکھایا ہے۔ پھر وہ ایسے لوگ ہوں جو اس شخص کا سا خلوص' اس کی دردمندی' اس کا سا سوز و ساز' اس کا سا اٹل کردار اور اس کا سا اسلامی تہذیبی شعور رکھتے ہوں۔ افسوس کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی انتظام نہیں کیا گیا کہ ۵' ۷ سال میں ہروقت سات آٹھ آدمی ویسی تعلیم و تربیت پا رہے ہوں جیسی مولانا نے حاصل کی۔

مولانا نے تحریکِ مجاہدین' تحریکِ خلافت' کانگریس' جمعیت العلما' مسلم لیگ' خاکساروں کا جائزہ لیا ہے' اور انگریزی سامراج کی دسیسہ کاریاں ایسی جز بہ جز بیان کی ہیں اور لادینی اسٹیٹ کے متعلق' مسئلہ تعلیم اور مسئلہ قومیت کے متعلق' مغربی تہذیب کے متعلق اتنا مواد پیش کیا ہے

کہ آج تک کی اس کی دوسری مثال نہ پیدا ہو سکی۔ بلکہ مغربی علوم و افکار کا تنقیدی جائزہ لے کر مختلف موضوعات پر اسلام کو متقابلاً" پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک مکمل نظام فکر و اعتقاد اور ایک سیاسی، معاشی و معاشرتی سسٹم ہے۔ مولاناؒ نے ہر دائرہ زندگی کے متعلق اصولی خاکے مرتب کر کے بعد کے محققین کے لئے راستہ ہموار کر دیا۔ "علی الخصوص" سوشلزم کے پروپیگنڈے کا جو محاذ کام کر رہا تھا، اسے توڑنے کے لیے سوشلزم کی ماہیت اور اس کے واقعاتی پہلوؤں کو سادہ انداز میں پیش کر دیا۔ لیکن ساتھ کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کو بھی اسی طرح نشانہ تنقید بنایا۔

مولانا مودودی کی اس پوری اسکیم کی جھلک موجود ہے جس کے ذریعے وہ انتشار زدہ ملت اسلامیہ کو اس کے اصل مقام (سعی اقامت دین) تک لے جانا چاہتے تھے۔ وہ کیسے آدمی اس کے لئے چاہتے تھے، وہ اسلامی تحریک انقلاب کو آگے بڑھانے کے کن طریقوں سے کام لینا چاہتے تھے، وہ نمائش اور ہنگامہ آرائی اور کوتاہ اخلاقی کے ان طور طریقوں کو تحریک کے لئے مہلک سمجھتے تھے جو دوسری سیاسی پارٹیوں یا فرقہ وارانہ مذہبی جماعتوں میں رائج تھے۔ انہیں اپنے آدمیوں میں مضبوط ایمان کے ساتھ، سرمایۂ علم اور روشن کردار کی ضرورت تھی۔ اس بات کو لٹریچر میں نہایت تفصیل سے پیش کیا گیا مگر دستور میں ان کے لئے اجمال کا پیرایہ اختیار کرنا ہی مناسب تھا۔ مولاناؒ کی دعوت کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ زندگی کو تضاد اور منافقت سے پاک کرو۔ اس بیماری نے ساری قوم کی رگوں میں زہر پھیلا دیا ہے۔

اسی سلسلے میں انہوں نے قرار دادِ مقاصد پاس ہونے کے بعد جب شرکتِ انتخاب کو جائز اور مد ذریعۂ کار سمجھا تو انہوں نے اس کے متعلق لٹریچر میں توضیح کر دی کہ جماعتی اصولوں، تحریکی اخلاق و کردار کو کسی بھی حال میں ووٹوں کے حصول اور نشستیں جیتنے کے لئے قربان نہیں کیا جائے گا۔

چند خاص خاص مندرجات قابل توجہ ہیں :۔

(۱) سیّد مودودیؒ کے مطالعات و مشاہدات کا ماحصل یہ تھا کہ ملّت اسلامیہ کو پستی سے نکالنے کا طریقہ صرف اقامتِ دین کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ یعنی خدا و رسولؐ پر ایمان لانا، کتاب و سنّت کے مطابق زندگی بسر کرنا، اور دین کی اس دعوت کو لے کر معاشرے کو اس کے لئے تیار کرنا کہ وہ دین کو سیاسی طور پر رائج اور غالب کرے۔

(۲) ساتھ ہی انہیں اسلام کے دُھندلے تصوّرات کے مقابلے میں یہ کام بھی اپنی دعوت

کے لئے ضروری محسوس ہوا کہ وہ اسلام کی فکری و ایمانی سیاسیات کے ساتھ ساتھ ہر مسئلے میں دین کا سسٹم بھی واضح کریں۔ نیز اسے عقلی و دینی لحاظ سے صحیح اور برتر بھی ثابت کریں۔

(۳) اس اصل تعمیری کام کی فکر کرنے کے ساتھ مولانا کو کانگریس اور انگریز کی سازش سے قائم ہونے والے ملحدانہ' وطن پرستانہ' لادینی اسٹیٹ کے خطرے کی طرف بھی قوتیں صَرف کرنی پڑیں جو مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے متعصب' مسلم دشمن ہندو کی زیادہ خوفناک غلامی میں مبتلا کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔

یعنی محاذِ جنگ بہت زیادہ وسیع ہوگیا۔ ایک طرف مسلمانوں کی اکثریت میں جہالت' جذباتیت' افتراقات' اخلاقی پستیوں' رسومِ فاسدہ' دینی جہالت و تضاد کے فروغ کے خلاف کام کرنے کی ضرورت۔ دوسری طرف افرنگی افکار اور مغربی معاشرت کا مسلمانوں میں تیز رفتار نفوذ اور اسے روکنے کی ضرورت۔ تیسری طرف انگریز اور ہندو کی سیاسی ملی بھگت کی زد سے مسلمانوں کو بچانے کی ضرورت۔ کانگرس کا ساتھ دینے والی مسلمان جماعتوں کو اس خطرناک روش سے بچانے کی ضرورت' اور بعد میں مسلم لیگ کے زور پکڑنے پر مسلم لیگی حلقوں کو اس بات پر متوجہ کرنے کی ضرورت کہ نہ صرف ضبط و تنظیم بلکہ اسلام کا علم حاصل کرنے اور اسلامی کردار اپنانے کی کوشش کی جائے' نیز اسلام کا نعرہ لگانے والی مقبولِ عوام تنظیم میں مخالفِ اسلام اور تارکِ اسلام عناصر کو نہ لیا جائے۔

کام کے اس درجہ پھیل جانے کی وجہ سے اصل بنیادی کام ایک محدود حلقے تک ہی جگہ بنا سکا' کیونکہ اگر وقتی سیاسی طوفان سے بچاؤ کی فکر نہ کی جاتی تو پھر سرے سے کام کرنے کا موقع نہ رہتا۔

بصیرت مند قومیں ہوتی ہیں جن کی سیاسی پارٹیاں ایک کام کرتی ہیں اور علمی یا دینی یا ثقافتی کام کرنے کے لئے اگر کوئی چھوٹی قوت یا ادارہ کام کرنا چاہے اور وہ کام فی نفسہٖ مفید ہو تو ان کو کام کرنے دیا جاتا ہے۔ جذباتی قومیں سب کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے زور لگاتی ہیں۔ جو ساتھ مل گیا وہ اپنا ہے' جو نہ ملا وہ دشمن ہے۔ اسی فارمولے کے تحت بعض پُرجوش مسلم لیگی شخصیتوں نے ملاقاتوں اور گفتگوؤں سے مولانا کو زچ کرنا چاہا۔ اخباری محاذ بھی اپنا کام کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سیّد ظفرالحسن کے نام ایک مکتوب محررّہ ۲۳ ر ربیع الثانی ۵۷ ھ میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے علامہ اقبالؒ سے ملاقات کا حال لکھا ہے۔

"سردست ہم مسلم لیگ سے اس سے بڑھ کر کوئی توقع نہیں کرسکتے کہ وہ

موجودہ غیر اسلامی نظامِ سیاست میں مسلمانوں کی قومی پوزیشن کو درپیش (؟) محفوظ کرنے ہی کی کوشش کرے گی۔ یہ چیز ہمارے اصلی نصب العین "دارالاسلام" سے بہت فروتر ہے۔ اس لئے ہم اپنے آپ کو مسلم لیگ کے ساتھ IDENTIFY نہیں کرسکتے۔ ہمارے لئے صحیح پالیسی یہ ہے کہ Rear Guard میں رہیں اور ایک طرف تو اپنے خیالات کی اشاعت سے مسلم لیگ کی اکثریت کو بتدریج اپنے نصب العین سے قریب تر لانے کی کوشش کرتے رہیں اور دوسری طرف مردانِ کار کی ایک ایسی طاقت ور جماعت تیار کرنے میں لگے رہیں جو دارالاسلام کی فکری بنیاد بھی مستحکم کرے اور مفکورہ (سوچا سمجھا خاکہ) کو جامہ عمل پہنانے کے لئے بھی مستعد ہو۔"

یہ عبارت طویل ملاقاتوں کے ماحصل کا ایک جزو ہے جو علامہ اقبالؒ سے مولانا مودودیؒ نے تین دن جاری رکھیں اور ان کا راز داں اور مولانا کے متعلقہ خط کا مخاطب سید ظفرالحسن جیسا ممتاز شخص تھا جس پر مسلم لیگ اور علامہ اقبالؒ بھی اعتماد رکھتے تھے۔ کہانی کی مثلث کے اس تیسرے اہم ضلع نے خط محفوظ رکھا اور سہ ماہی "المعارف" (ادارہ ثقافت اسلامیہ) نے شائع کردیا۔

نہایت جوشیلے دور میں تقسیم کار کا فارمولا لوگوں کی توجہ سے ہٹ گیا اور علی الخصوص لادینیت پسند اور سوشلسٹ اور مغرب پرست تارکینِ اسلام اور ان کے زیرِ اثر اہلِ محراب و منبر اور اصحابِ صحافت اور عوام اس کوشش میں لگ گئے کہ اس خطرناک دینی کام کو نہ ہونے دیا جائے اور مولانا مودودیؒ کو گھسیٹ کر مسلم لیگ میں لاکر ایک بے بس پُرزہ بنا دیا جائے اور ان کی جماعت کے قافلۂ اقامتِ دین کو بکھیر دیا جائے۔ اس طرح مولاناؒ کے لئے اپنوں نے ہی کام کی مشکلات بڑھا دیں اور ان کو ہدفِ طعن و بحث بنا لیا۔ اس کا خمیازہ پاکستان نے اس طرح بھگتا کہ آج یہاں ایک چپہ زمین پر امن تک باقی نہیں' مظلوموں کو انصاف میسّر نہیں' شہریوں مجرموں اور تخریب کاروں اور پولیس کے جبّاروں سے پناہ حاصل نہیں۔ کھلّم کھلاّ رشوت اور ملاوٹ کے بازار لگے ہیں۔ سود' قمار' شراب' رقص و سرود اور خواتین کا جدید طریقوں سے خوفناک استحصال وغیرہ بیماریاں بڑھ رہی ہیں' اخلاقی قدریں مٹ رہی ہیں' خدا کا خوف اور رسولؐ کی محبت اور محاسبۂ آخرت کی تشویش' سب رخصت۔

مولانا مودودیؒ' چوہدری نیاز علی خاں صاحب سے ابتدائی دنوں میں بات کرتے ہوئے فرماتے

ہیں کہ " ہم خالص قرآن کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ (Renaissance) چاہتے ہیں" (ص ۲۷۰٬۲۷۱)

ماحول٬ حالات کا تغیّر مولانا کے پروگرام پر کس طرح اس مرحلے میں اثرانداز ہوتا ہے اور اس کی نوعیّت کیا ہے ؟ کیا توجیہ و تعبیر کی جائے گی۔ فرمایا :

" .... بنیاد کو مضبوط کرنے کے اسی تعمیری کام کے سوا کوئی دوسری چیز کارگر نہیں ہوسکتی جس کا نقشہ میں بنا چکا ہوں۔ دوسری طرف مسلمانوں کے پراگندہ انبوہ اور انقلاب کی منظم فوجیں جس تیزی کے ساتھ تاخت کر رہی تھیں٬ اسے دیکھ کر میں سمجھ رہا تھا اب بلا تاخیر بچی کھچی قومی حالت کو سنبھالنا ضروری ہے۔ ورنہ جتنی دیر میں ہم اپنے تعمیری کام کو اس حد تک ترقی دے سکیں گے کہ وہ قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو اتنی دیر میں قوم ہی ختم ہوجائے گی۔ (ص ۳۷۶)

کاش مسلم لیگ میں ایسے باشعور اصحابِ فکر موجود ہوتے اور ان کا قابو جوشیلے عوام پر ہوتا اور وہ خود جان سکتے اور جماعت کو سمجھا سکتے کہ مولانا مودودیؒ اگرچہ کام کا ایک مستقل تعمیری نقشہ رکھتے ہیں٬ مگر وہ قوم کو دشمن طاقتوں کا لقمہ نہیں بننے دینا چاہتے۔ اسی چیز نے ان سے سیاسی کشمکش حصہ دوم اور مسئلہ قومیت جیسی کتابیں لکھوائیں ۔ مگر مورچوں پر لڑنے والے سپاہی اگر دور بیٹھے سائنس دانوں٬ اسلحہ سازوں اور سپاہیوں کے مربیوں کے پیچھے پڑ جائیں کہ سب یہاں آکر لڑو٬ ورنہ تم وفادار نہیں ہو ----- تو ایسی صورت میں ساری جنگی مشینری تباہ ہوجائے گی۔ مولاناؒ خطروں کی لپیٹ میں آئے ہوئے مسلمانوں کو ایک خاص طریق سے مدد پہنچا رہے تھے اور تھوڑا بہت اپنا بنیادی تعمیری کام بھی کر رہے تھے۔

تعجّب ہے کہ جماعتِ اسلامی سے ۵۷ میں نکلنے والوں نے اور ان کے ہم رنگ پیش رؤں نے مولاناؒ کے طرزِ فکر اور پروگرام کی اس بہت بڑی تبدیلی کو کیوں نہ محسوس کیا۔ اور پھر اس تبدیلی میں یہ سبق بھی ہے کہ معاملہ خالص اضطرار کا تھا جس کے تحت مولاناؒ نے اپنی جنگی اسکیم کے رُخ متعین کردیئے تھے٬ مگر جو نئی اسکیم اختیار کی اس کے تحت بھی کام اپنے ڈھب سے کیا۔ اسلامی لحاظ سے کوئی مکروہ اطوار اختیار نہیں کیے۔

مولانا کی مجوّزہ اسکیم کے کئی اہم اجزا بعد میں نگاہ سے اوجھل ہوگئے۔ مثلاً مولانا کا ایک منصوبہ شعبۂ علمی کے تحت مختلف دائرہ ہائے علوم میں تحقیقی و اجتہادی کام میں نوجوان قوتوں کو

لگانا تھا۔ یہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہوگیا۔ مولانا کی تعلیمی اسکیمیں اور ان کا فلسفہ اور ان کے مجوزہ کام بھی فراموش ہوگئے۔ دارُالاسلام کو انھوں نے مثالی بستی قرار دیا (ص ۴۲۲) ۔ بعد میں وہ وقت آیا کہ ہمارے اکابر کہنے لگے کہ اس طرح کا کوئی کام کرنا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔ خصوصاً منصورہ کے قائم ہونے کے بعد بار بار کہا گیا کہ یہ مثالی بستی نہیں ہے (اور نہ ایسی بستی یہاں بنانے کا ارادہ ہے) ۔

مولانا مودودیؒ کے کارناموں میں سے نہایت ہی اہم کارنامہ اسلامیہ کالج میں اسلامیات پڑھانے کے لئے اپنے خاص میتھڈ کے تحت ایک ایسا کام کرنا ہے جس نے گورنمنٹ کالج لاہور تک کے طالب علموں کو کھینچ لیا۔ اس سلسلے میں مؤلف نے کئی اصحاب کے حوالوں سے مواد جمع کیا ہے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے حاشیہ میں مختلف حوالوں سے ایک اُلجھن پیش کی ہے کہ مولاناؒ نے یہ خدمت کب شروع کی اور کب ختم کی۔ حالانکہ اس سلسلے میں ایک زندہ شہادت ڈاکٹر باقر جیسی شخصیت کی موجود ہے' جو اسی دن اسلامیہ کالج میں تعینات کیے گئے جس دن مولانا مودودیؒ اور اتفاق کہ ٹھیک اسی دن ان کا تعلق اسلامیہ کالج سے منقطع ہوا جس دن مولانا کا۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں ان کی تحریر چھپی بھی ہے یا کوئی خط میں نے دیکھا ہے یا مجھ سے گفتگو ہوئی ہے۔ مؤلف کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ ان سے رابطہ کرتے۔ یا اب دوسرے ایڈیشن کے لیے کریں۔

سید عبدالعزیز شرقی صاحب کا بیان ہے کہ ایک اجتماع میں دارُالاسلام کے لئے جب ضابطوں کی بحث آئی تو ان میں ایک تجویز یہ تھی کہ جو لوگ دارُالاسلام بنانے کے لئے اٹھیں وہ خود عملاً مسلمان ہوں اور اسلامی تہذیب و تمدّن کا نمونہ بنیں..... جب یہ شق زیرِ بحث آئی تو چوہدری نیاز علی خاں (مرحوم) نے کہا کہ "یہ تو قابلِ عمل نہیں ہے۔" (دیکھئے ایک محبِّ اسلام کا جذبۂ اتباع اسلام!)

سید عبدالعزیز شرقی اور اس صورتِ واقعہ کے ایک گواہ خواجہ اقبال احمد ندوی [۱] جو نوعمری کے دور میں تھے اس بات پر متفق ہیں کہ اختلاف دارالاسلام کے دستوری خاکہ کی ایک (متذکرہ) شق پر پیدا ہوا جو آگے چل کر خلیج کی صورت اختیار کرگیا۔ شرقی صاحب کہتے ہیں کہ

۱۔ خواجہ صاحب دوسری طرف کہتے ہیں کہ چوہدری نیاز علی خاں کا اختلاف اس دفعہ پھر ہوا جس میں تحریک دارالاسلام کا نصب العین اسلامی حکومت کا قیام قرار دیا گیا۔ (زندگی۔رام پور اپریل ۱۹۸۷) دراصل چوہدری صاحب کا مرکزی اختلاف یہی تھا' ضمناً" دوسری باتیں بھی بحث میں آئیں۔

چوہدری صاحب کے قول کا جواب میں نے ہی دیا اور وہ یہ تھا کہ "جن لوگوں کے نزدیک قابلِ عمل نہیں ہے وہ پیچھے ہٹ جائیں۔ شیخ صاحب جھنجلا کر بولے: "یہ کیسے ہو سکتا ہے' میں وقف کرنے والا ہوں۔" پھر بحث چل پڑی جس میں مولاناؒ نے چوہدری صاحب سے فرمایا: "آپ ایسا کیجئے کہ آپ اس کا نام نیاز علی ٹرسٹ رکھ لیجئے' مسلم ٹرسٹ یا اسلامی ٹرسٹ رکھ لیجئے۔" مگر چوہدری صاحب نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔

اس قصّے کو بیان کرتے ہوئے ہمارا مورّخ سارا الزام شرقی صاحب پر یہ کہ کر رکھ دیتا ہے: "اس تلخی کی ذمّہ داری بڑی حد تک شرقی صاحب پر عائد ہوتی ہے۔" کیوں؟ بات ایک تو منطقی تقاضوں کے مطابق حق تھی' دوسرے ہو سکتا ہے کہ اجتماع کے علاوہ دوسرے اوقات میں شرقی صاحب پر عندیہ واضح ہو اور ایک تلخ بات کہنے کے لئے مولانا کو آگے کرنے کے بجائے شرقی صاحب نے ان کے حصّے کا بار خود اٹھا لیا ہو۔ تیسرے یہ کہ بعد کی گفتگو میں مولاناؒ نے جو فقرے چوہدری صاحب سے کہے وہ شرقی صاحب کے قول کی تائید میں ہیں۔ چوتھے اگر مولانا بات کو کسی اور راستے پر لے جانا چاہتے تو وہ ایک طرف شرقی صاحب سے کہتے کہ دیکھئے' چوہدری صاحب وقف کرنے والے ہیں ان کی بات کو دوسرے انداز میں لینا چاہئے' دوسری طرف وہ بحث کی آگ کو مزید بھڑکنے سے پہلے یہ تجویز رکھتے کہ کچھ وقفہ رکھا جائے جس میں فریقین از سر نو غور و خوض کر سکیں۔ پانچویں یہ بات کہ کیا چوہدری صاحب کو صاحبِ وقف ہونے کی بنا پر دارُالاسلام کے ایک ایسے ضابطے سے مستثنیٰ قرار دے دیا جاتا جو عین اساسی تقاضائے اسلام تھا یا سرے سے اسے ضابطے سے اڑا دیا جاتا۔ کیا آپ یہ تصوّر کر سکتے ہیں یہ معاملہ اتنا دو ٹوک ہے کہ تجربہ کاری اور ناتجربہ کاری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر شرقی صاحب بچے بھی تو نہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے از رہِ انکسار اپنے آپ کو قصور وار گردانا ہو۔ پھر بعد میں جو وفد چوہدری صاحب سے گفت و شنید کرتا ہے وہ ناکام لوٹتا ہے کیونکہ وجہِ نزاع ایسی تھی Non Compromising تھی۔ ایسی کسی بات کو اگر شرقی صاحب کہتے' یا صدر الدین اصلاحی یا خواجہ اقبال ندوی تو ہر صورت میں بجا ہوتی۔ یہاں شرقی صاحب خواہ مخواہ ہمارے مورّخ کی قلم کی زد میں آکر قابلِ رحم محسوس ہوتے ہیں' جیسے سارا کام انہوں نے خراب کر دیا۔

مولانا کا بعد کا یہ بیان بھی پیش نظر رکھئے کہ انتقالِ مرکز کے بارے میں وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ جو مقاصد اور اصول ہمارے پیش نظر ہیں ان کے تتبّع میں کام کرنے کا موقع یہاں (یعنی دارالاسلام وقف میں) نہیں مل سکتا۔ ایک خط میں عنایت اللہ اثری صاحب کو لکھتے ہیں کہ

"دارالاسلام ٹرسٹ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی ہدایت کے تحت کام کروں' جیسے کہ خواجہ صاحب (اقبال احمد ندوی) کا بیان ہے کہ "چوہدری صاحب دارُالاسلام کے دستور میں اسلامی حکومت کا نام نہیں چاہتے تھے۔"

ایسی صورت میں چوہدری صاحب اور مولانا یا تحریک دارالاسلام میں "عدم جلد بازی"' تدبر و تفکر" اور مصلحت بینی سے کیا حل نکالا جاسکتا تھا؟ یعنی بجائے اس کے چوہدری صاحب کے طرزِ فکر کی کوتاہی واضح ہو اور اس پر توجہ ہو' محسوس یہ ہوتا ہے کہ سارا معاملہ شرقی صاحب نے خراب کردیا۔ (خدا مولاناؒ پر بھی اور چوہدری صاحب پر بھی رحمت و غفران نازل فرمائے) مورخ کو کسی غلط پوزیشن کا ملبہ کسی ایک شخص پر نہیں ڈال دینا چاہیے۔

آخر میں ہم یہ کہنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک طرف مولانا کی ذہنی اور عملی تیاریوں اور علمی و تحقیقی جذبات کا تذکرہ ہے' دوسری طرف تحریکی اور جماعتی کام کے مختلف دور اور پہلو سامنے آتے ہیں۔ تیسری طرف نہایت ہی مکدّر ماحول میں کام کرنے والی سیاسی اور مذہبی قوتوں کی روا روی دکھائی دیتی ہے۔ مولانا کو مخالفتوں اور سرکاری اور نیم سرکاری اور مذہبی حلقوں سے اٹھنے والے پروپیگنڈے کا تصوّر حاصل ہوتا ہے' مسلم لیگ کی انتقام پسندانہ روش کے کمالات دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور بیرونی دشمن طاقتوں کے مادہ پرستانہ چکروں کے مالیاتی' معاشی اور ثقافتی حملوں' نیز عالمی پروپیگنڈے کی طوفان خیزیوں اور یہود و ہنود کی سازش کاریوں کے پھندوں کا جائزہ لیتے ہیں تو خدا کی اس مہربانی کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے تھوڑی سی تعداد میں' اسلام کا کام کرنے والے غریب طبقوں کے لوگوں کو کتنا اثر و نفوذ بخشا ہے۔

اس کتاب کو مؤلف نے بڑی عرق ریزی اور اپنے خاص دلی جذبات کے ساتھ لکھا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغی کام کے ہر لفظ میں ان کا دل دھڑک رہا ہے۔

کتاب چھپنے کے بعد جب طباعتی غلطیوں کی عام شکایت ہوئی تو ایک مجلس تشکیل دی گئی جس نے ایسی غلطیوں کی فہرست تیار کی جو بہت لمبی تھی' پھر ان میں سے ضروری الفاظ کا تصحیح نامہ کتاب کے ساتھ لگا دیا گیا۔

آباد شاہ پوری صاحب کی ولولہ انگیز نگارش اور مولانا مودودیؒ کی اہم تحریروں کے اقتباسات' نیز واقعات و اشخاص کے تذکروں کو ادارۂ معارف اسلامی منصورہ لاہور کے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے اور اس کتاب کا تقسیم کنندہ المنار بک ڈپو (منصورہ' لاہور) ہے۔ کاغذ دبیز اور سفید' کمپیوٹر کی خوبصورت طباعت' مضبوط گتے کی جلد اور اس پر کتاب کے نام کے لئے

باقی بر صفحہ ۱۰۴

مطبوعات

ہماری نظر میں : مولانا ماہر القادری مرحوم موسس ماہنامہ فاران کراچی۔ مرتب جناب طالب الہاشمی۔ مقدمہ از وارث سرہندی مرحوم۔ صفحات ۵ سو سے زائد۔ مجلد مع رنگین گرد پوش۔ ناشر عبدالرحمٰن صابر قرنی' ڈائریکٹر حسنات اکیڈمی' منصورہ' لاہور۔ قیمت ۹۵ روپے۔

وہ مخصوص عنوان جس کے تحت مولانا ماہر القادری مرحوم کتابوں پر تبصرے لکھتے تھے اسی عنوان کو کتاب کا نام بنا دیا گیا ہے۔ یہ تبصرے جامع ہوتے' کتاب کے بامعانِ نظر مطالعہ کرنے کا ثبوت دیتے' موضوعات و مسائل پر بحثوں کے ساتھ ساتھ ماہر صاحب محاسنِ علمی و ادبی کی دل کھول کر تحسین کرتے اور "دوسرا رخ" کی سرخی لگا کر علمی' تاریخی' نظریاتی اور فنی و لسانی کمزوریوں پر ایسی گرفت کرتے کہ انصاف کا حق ادا ہو جاتا' مگر بعض لوگ ان کی گرفت پر بلبلا اٹھتے بلکہ شاید زندگی کے بعد بھی وہ دل میں ٹیسیں محسوس کرتے ہوں۔ لیکن ماہر صاحب ایک جج کی طرح بڑی سنجیدگی اور غیر جانب داری سے ترازو کے دونوں پلڑوں کا پورا پورا حساب لگاتے۔ تحسین و تعریف کے امیدوار تو ان کے خلاف آگ بگولا ہو جاتے (ماہر صاحب پھر بھی ٹھنڈے رہتے) مگر حقیقت پسند حضرات اپنی کتابیں ماہر صاحب کے ہاں شوق سے بھیجتے اور پھر ان کے تبصروں کے دونوں رُخوں سے یکساں مُستفید ہوتے۔ سچی بات یہ ہے کہ زبان اور محاوروں کے معاملے میں تو "ہماری نظر میں" جو کچھ لکھا گیا وہ ایک ایسا سبق ہے جس سے مُبتدی اور مُنتہی حضرات اپنے اپنے درجے میں بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔

۷۶ کتابوں پر جن میں سے بعض دینی (تفسیر' حدیث اور فقہ) مباحث کے متعلق' اور سوانح کے متعلق اور بعض ادب اور شاعری کے متعلق ہیں' ان سارے دائروں میں مواد اور نظریات اور اصطلاحات' فرقہ وارانہ قضیوں' بدعات اور فرنگیات وغیرہ کے متعلق کتابوں کے حوالوں اور

اسناد کی ساتھ بحثیں کرنا اور اسی طرح ادبیات اور شاعری میں حسن و قبح کی چھانٹ پرکھ کے لئے لسانی یا محاوراتی یا فنی تجزیہ کرنا اور اساتذہ کے نظائر پیش کرنا' یہ ساری متاعِ نظیف و لطیف اس کتاب میں اتنی ہے کہ ترجمان کے تعارفی انداز کے مختصر تبصروں میں اس کی جھلک پیش کرنا ممکن نہیں۔ مختلف انحراف پسند مصنفین کی ایسی ایسی باتوں پر میں نے نشان لگایا ہے جو کسی مسلمان کی طرف سے سامنے آنے پر سر چکرا جاتا ہے۔ سوشلزم' عورت' تصویر' نظریۂ ارتقا' تصوّف' سلاطین کی خُوشنودی کے لئے ہاتھ کے ہاتھ حدیثیں گھڑنے والوں اور دوسرے بے شمار مسائل پر ماہر صاحب کے قلم سے پُھوٹتی کونپلیں --- میں کیسے بیان کروں۔

البتہ اتنا ضرور بیان کر دوں گا کہ اس کتاب میں سب سے زیادہ پُر زور اور شاندار تبصرہ جوش ملیح آبادی کی کتاب "یادوں کی بارات" پر ہے۔ جوش صاحب کی زندگی' شاعری' ان کی دلچسپیوں اور ان کے تضادات اور غلط بیانیوں کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جو کسی وجہ سے ماہر صاحب سے برسوں سے ناراض تھے انہوں نے لکھا کہ "جو شخص ایسا تبصرہ لکھ سکتا ہے اس کے سات خون معاف کئے جا سکتے ہیں۔"

فاضل مؤلف کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ماہر القادری صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کا ریکارڈ بطور کُتب اشاعت میں لا کر محفوظ کرنے کے لئے سلسلۂ مطبوعات شروع کر رکھا۔ "ہماری نظر میں" کے زیرِ عنوان ماہر صاحب نے ۳۰ سال میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک جلد میں نہیں سما سکتا۔ مختلف ادوار کے ۶۷ منتخب تبصروں کو پہلی جلد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مؤلف نے بڑی ذمہ داری یہ کہہ کر قارئین پر ڈالی ہے کہ اگر اس "جلد" کا خیر مقدم حوصلہ افزا طریق سے کیا گیا تو وہ بقیہ جلدیں بھی یکے بعد دیگرے پیش کر دیں گے۔

میرا خیال ہے کہ دنیائے علم و ادب اور طلبائے نقد و نظر کے لئے یہ ایسا گراں قدر تحفہ ہے کہ اہلِ ذوق کو اس کے لئے اپنے دلوں کے دامن پھیلا دینے چاہئیں۔

وفودِ عرب بارگاہِ نبویؐ میں : مؤلف : طالب الہاشمی۔ ناشر: شفیق الاسلام فاروقی' حرا پبلی کیشنز' فضل الٰہی مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ اچھی طباعت اور مجلّٰی جلد بندی۔ ۲۹۶ صفحات - قیمت ۶۰ روپے۔

یہ کتاب سیرتِ پاکؐ ہی کے ایک باب کو پیش کرتی ہے۔ اس کے مؤلف جناب طالب الہاشمی سیرت نگاروں کی دنیا میں جانے پہچانے ہیں۔ خاص طور پر سیر صحابہؓ کے دائرے میں خامہ

فرمائی کرنے والوں میں ان کو گلِ سرسبد کہا جا سکتا ہے۔

اس سے پہلے درجنوں کتابیں شمعِ رسالتؐ کے پروانوں کی سیرت پر تالیف کرکے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں ـــ "وفودِ عرب بار گاہِ نبویؐ میں" ان کی تازہ اور اپنی نوعیت کی بہترین تالیف ہے۔

۵ ہجری میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں وفود کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور وفات سے چار ماہ یا بروایتِ دیگر چالیس روز پہلے تک جاری رہا۔ ۹ ہجری میں تو اتنی بہتات اور کثرت سے وفود آئے کہ اس سال کا تو نام ہی "عام الوفود" پڑ گیا۔

یہ وفود عرب کے کونے کونے، گوشے گوشے سے مختلف قبائل اور علاقوں سے آئے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کی مختلف النوع تعلیمات اور برکات سے مالا مال ہو کر واپس ہوئے۔ کچھ وفود اسلام کی انمول نعمت سے شاد کام ہونے کے لئے آتے اور کچھ احکامِ اسلامی کی تعلیم کے حصول کے لئے آتے۔ یہ لوگ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیمانہ تبلیغی انداز اور آپؐ کے حسنِ اخلاق سے اتنے متاثر ہوئے کہ پھر ہمیشہ کے لئے آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ بعض وفود محض آپ کی زیارت و بیعت سے مشرف ہونے کے لئے آتے۔

وفود میں آنے والے لوگوں نے واپس اپنے قبائل اور علاقوں میں جا کر تبلیغ دین کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی اور بڑے جوش و جذبہ اور سرگرمی سے انجام دیا۔ یہاں تک کہ اقلیم ریاست ۱۲ لاکھ مربع میل تک وسیع ہو گئی۔ اسلامی معاشرہ مضبوط ہوا اور دشمن طاقتوں کو مسلسل شکستیں ہوتی چلی گئیں۔ ہاشمی صاحب کا اندازِ بیان دلنشین، سلیس اور نفیس ہے (ع۔ د)

"سیرتِ احمدِ مجتبیٰؐ" ۔ جلد دوم: از جناب شاہ مصباح الدین شکیل۔ ناشر: پاکستان اسٹیٹ آئیل کمپنی لمیٹڈ۔ داؤد سینٹر، مولوی تمیز خاں روڈ، کراچی۔ دبیز سفید کاغذ، طباعت اجلی (کتابت قدرے جلی ہے) نہایت مضبوط اور رنگین گرد پوش (پلاسٹک کے کور) سے مزین، ۵۵۲ صفحات، نقشوں اور تصاویر سے مزین، قیمت درج نہیں۔

سٹیٹ آئیل کا تیل تو آپ دیکھتے ہی ہیں، اس تیل کی دھار یہ گراں قدر تالیف ہے۔ کاروبار کرنے والے ادارے بہت، مگر ایسے ادارے شاذ جو دنیا کے لئے بھی کمائی کریں اور آخرت کے لئے بھی۔ تیل قوم کی مادی زندگی سے متعلق ہے، سیرتِ احمدِ مجتبیٰؐ ایمانی زندگی کے

لئے غذا ہے۔ راقم ناچیز تو سٹیٹ آئیل کی اس خدمت اور سیّد مصباح الدین شکیل صاحب کے قلم کی گلفشانیوں سے پہلے دن ہی شدید طور پر متاثّر ہوا۔ اب سیرت کے اس پیارے کام کی جو بھی نئی کڑی سامنے آتی ہے باوّلِ نظردل موہ لیتی ہے۔

پہلی جلد کا عنوان تھا "ظہورِ قُدسی سے قباء تک" اور اب اس دوسری جلد کی لوح پیشانی پر درج ہے "قباء سے واقعہ اِفک تک" تقسیم ادوار کی یہ ایک نئی صورت ہے۔ دونوں جلدوں کے مقرّرہ دور سے مُتعلق تمام واقعات و احوال کو خوبصورت زبان میں' ادبی چاشنی کے ساتھ' پھر ذیلی عنوانات کے لئے بالعموم نہایت موزوں مصرعوں کا استعمال جو حسن ذوق کا گواہ ہے۔ مثلاً اس دوسری جلد میں اس وقت میرے سامنے ص ۴۶ ہے۔ یہاں ذکر ہے۔ مکّہ سے ہجرت کر کے آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے بیٹھنے کا' جس کے بہ اختیارِ خود بیٹھنے میں الہامی رہنمائی اور معجزے کا رنگ شامل تھا۔ (ارشادِ رسالتؐ: "اس کی مہار چھوڑ دو' یہ پابندِ حکم کی گئی ہے۔") اس قصّے کا عنوان شکیل صاحب نے یہ لگایا ہے۔ "آئی صدائے جبرئیل' تیرا مقام ہے یہی" یہاں اونٹنی کی نشست کی طرح مصرع کی نشست بھی کیسی موزوں ہے؟ یا مثلاً ص ۲۱۹ پر ۔" بے تاب نہ ہو' معرکۂ بیم ورجا دیکھ" یا ص ۳۴۴ پر ۔ "دنیا میں بھی میزان' قیامت میں بھی میزان"۔

واقعات کے ساتھ ضروری اسماء' حوالے' اختلافات اور دلائل بھی مختصراً" بیان کئے گئے ہیں۔

پہلی جلد کو اہلِ نظرنے پاکستان اور بیرون پاکستان میں جس ذوق و شوق سے اس کتاب کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان تبصروں اور ایوارڈوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جو جلد دوم میں مذکور ہیں۔

پیش لفظ جناب میاں محمد فرید مینجنگ ڈائریکٹر پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ (پاکستان) نے لکھا ہے۔

ہم جہاں یہ دعا کرتے ہیں کہ خداوند کریم سیرتِ احمدِ مجتبیٰ کو قبولیتِ عامہ کے اعلیٰ مقام پر پہنچائے اور اس کے مطالعہ سے نوجوانوں اور تمام افرادِ قوم کی زندگیاں سنوریں وہاں ہماری دعا یہ بھی ہے کہ پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی اور اس کے مینجنگ ڈائریکٹر میاں محمد فرید صاحب اور فاضل سیرت نگار شاہ مصباح الدین شکیل اور اس کام میں حصہ لینے والے تمام خوش قسمت اصحاب کو اپنی رحمت بے پایاں سے بہرہ مند کرے۔

اقبالؒ کا ذہنی و فنی ارتقا: ڈاکٹر پروفیسر عبدالمغنی (پٹنہ۔ بھارت)۔ ناشر: انجمنِ ترقیٔ اردو (ہند) نئی دہلی (پتہ کتب خانہ اردو بھون۔ سقف ۲۔چوہٹہ۔پٹنہ ۴۔۰۰۔ ۸۰۰ (بھارت)

ڈاکٹر عبدالمغنی اردو تنقید کے دائرے میں اتنا بڑا مرتبہ رکھتے ہیں اور اتنا کام کر چکے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ' کوئی شخص خود ان کے کام پر تفصیلی تحقیقی مقالہ (یا کتاب) تیار کرے۔

ڈاکٹر صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انگریزی لٹریچر اور ادبی نظریات پر عبور رکھنے کے باوجود اپنے تصوّرات و اقدار کو سلامت رکھ کر سوچتے ہیں اور جدیدی طبقوں کی کمزوریوں سے ماہرانہ آگاہی رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب پر مغربی تسلط کو توڑنے کے لئے اس طرح کام کیا ہے جیسے کوئی طاقت اپنے ملک و وطن کو کسی غلام ساز طاقت سے آزاد کراتی ہے۔

بدقسمتی سے مغربی نظریات کی پالکیاں اٹھانے والے معزز کہاروں نے اقبالؒ کو خاص طور پر ہدف بنائے رکھا' کیونکہ اقبالؒ تو مغرب سے بغاوت کرنے میں "اوّل المجاہدین" کا مقام رکھتا ہے۔

مثلاً اسی مسئلے کو لیجئے کہ اقبالؒ کے کام کو جن تین ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے پہلے کو یا پہلے اور دوسرے کو فن کا آئینہ دار قرار دیا گیا اور بعد کے سارے کلام کو فکر کا آئینہ دار۔ یعنی بعد کے اہم ترین دورِ اقبالؒ کو فنی لحاظ سے کمزور شمار کر کے گویا لوگوں کی توجہ ابتدائی حصّے پر مذکور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے' کیونکہ فکر یا پیغام سے ان حضرات کی جان جاتی ہے۔

جناب عبدالمغنی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اقبالؒ کی فکر اور اس کا پیام نہ صرف بانگِ درا (یا بانگِ درا اور بالِ جبریل) میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ بلکہ بعد کے ادوار میں جسے تم فکر کا دور کہتے ہو اس میں اقبالؒ کا فن اپنے معیار پر قائم ہے' بلکہ ارتقاء کرتا رہا ہے۔ کیا خوب لکھا ہے کہ :-

> "بانگِ درا ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود کی طرف روانگی کا اعلان ہے۔ منزل کی طرف سفر تو ۱۹۰۱ء کے آس پاس ہی سے شروع ہو گیا تھا اور راستے کے نشانات بھی واضح تھے۔ ساری کاوشیں ایک معیّن رخ پر سفر کی رفتار تیز کر کے مقررہ منزل تک پہنچنے کی کرنی تھیں۔ اور مغرب کی ہواؤں نے بس مہمیز کا کام کیا جس کے بعد بالِ جبریل سے پرواز کا مرحلہ آیا اور آگے بڑھ کر ضربِ کلیم سے بھی کام لینا پڑا' یہاں تک کہ ارمغانِ حجاز کے سامان بہم ہو گئے۔ (ص ۲۳)

گویا "بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را" چند الفاظ میں اقبالؒ کی فکر و فن کی مکمل تصویر تیار ہو گئی۔ پھر عبدالمغنی صاحب ابتدائی دور اور بعد کے ادوار سے تخلیقات کی مثالیں لے لے کر اور ان کی وضاحتیں کر کر کے اس حقیقت کو منواتے ہیں کہ :۔

"ابتدائی اشعار میں بھی بے ساختگی' برجستگی' شستگی اور رفتگی ہے' جو آئندہ اشعار کی بڑھتی ہوئی سنجیدگی' عمدگی اور بالیدگی میں بھی برقرار رہتی ہے"

(ص ۲۴)

زیادہ تفصیل میں جانا مشکل ہے۔ اپنے ان دعووں کے ثبوت میں وہ ابتدائی دور کے کلام کے بہت سے اجزاء بھی لا کر دکھاتے ہیں کہ فن کے ساتھ فکر شامل ہے۔ پھر وہ بعد کے ادوار کی نظموں اور اشعار کو سامنے لا کر دکھا دیتے ہیں کہ فکر کی وجہ سے جو غلو بعد کے کلام میں ہے۔ اس کے ساتھ فنّی جمال میں بھی کمی نہیں آئی۔

پھر عبدالمغنی صاحب (شاید انگریزی ادب کے استاد ہونے کی وجہ سے) تشریح ایسی خوبی سے کرتے ہیں کہ جن چیزوں کو لوگ چھپائے رکھنا چاہتے ہیں وہ انہیں کھول دیتے ہیں اور جہاں کہیں مفہوم کو غلط رخ دیا گیا ہو' وہاں سیاق و سباق اور دوسری متوازی نظموں کے عناصر کو شہادت میں لا کر رُخ درست کرتے ہیں اور اس طرح دعوے اور بحث کی ڈور مقابل کے ہاتھ سے چھین کر اسے نہتّا کر دیتے ہیں۔

افسوس کہ میں زیادہ لکھنے کا موقع نہیں رکھتا۔ بس قارئین سے یہ کہوں گا کہ اقبالؒ کو جدیدیوں اور سوشلسٹوں کے حملوں سے جتنی بھی جراحتیں آتی تھیں' عبدالمغنی نے ان کا درماں کر دیا ہے۔ اقبالؒ کے متعلق ان کی متعدد تفصیلی کتب آچکی ہیں' انہیں پڑھیئے اور اقبالؒ کو نئے سرے سے سمجھئے۔

تصوف اور اہلِ تصوف : از مولینا سید احمد عروج قادریؒ۔ مرتب ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی۔ ناشر: مرکزی مکتبۂ اسلامی' ۱۳۵۳' چتلی قبر' دہلی نمبر ۶ (بھارت)۔ کاغذ' طباعت مناسب۔ سرورق رنگین۔ صفحات ۲۷۵۔ قیمت ۴۰ روپے۔

پہلا مختصر جملہ تو میں یہ کہوں گا کہ اپنے موضوع پر بہت اچھی کتاب ہے اور مصنف مرحوم کے فکری و تخلیقی ذوق کی وجہ سے اس کی بحثیں بڑی متوازن اور سوچنے کی نئی راہیں کھولنے والی ہیں۔

قادری صاحب رحمتہ اللہ اچھے عالم، گہرا اور وسیع مطالعہ کرنے والے اور مسائل کا باریکی سے تجزیہ کر کے نتائج نکالنے کے ماہر تھے۔

تصوّف کے متعلق دو انتہا پسندانہ ذہن ہیں۔ ایک تو تصوّف کا خیال آتے ہی "لب بہ بند و چشم بند و گوش بند" کی راہ کا سالک بن جاتا ہے۔ دوسرا تصوّف کا نام آتے ہی اس کے متعلق اپنے کان ضرور بند کر لیتا ہے اور زبان سے کچھ مخالفانہ جملے کہہ دیتا ہے۔

عروج صاحب نے دونوں ذہنوں کے لئے ایک درمیانی راستہ نکالا ہے۔ عروج صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ تصوّف کی ایک نوعیت وہ ہے جو دراصل تزکیۂ نفس کا ایک نیا نام ہے۔ اس کا مقصد اسلام کے قلب کو قلبِ سلیم بنانا، نیت میں اخلاص پیدا کرنا، توجہات کا اصل مرکز خدا کو بنانا، غیراللہ کے برپا کردہ ادیان، عقائد، نظاموں، رسوم، شعائر وغیرہ سے اپنا تحفظ کرنا ہے۔ مزید یہ کہ خدا کی عبادت یا بندوں کی خدمت کے کاموں کو ریا سے بچانا، نیز ذکر، فکر، توکل، صبر، قناعت، رضا وغیرہ خوبیوں کا اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔

دنیا پرستی، جاہ پرستی اور قوّت پرستی بلکہ عقل پرستی کے اُبھار نے تصوّف کے رحجان کو اولاً" پُر زور بنایا۔ بہرحال ایک طریقِ کار یا رحجان نے زور پکڑا تو اس کی اصطلاحات بھی وجود میں آنے لگیں۔ علاوہ بریں عجمی تصوّرات اور ہندی فکریات و معمولات نے بھی تصوّف میں راستہ بنایا۔ خصوصاً" وحدت الوجود اور وحدت الشہود اور فنافی اللہ اور فنافی الشیخ وغیرہ قسم کے فلسفیانہ شگوفے بھی بہار دکھانے لگے۔ مولینا عروج قادری کے مباحث سے ہٹ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کاروباری تصوّف کا بھی ایک خاص نہج بنا۔

مولینا عروج قادری صاحب نے بڑا اہم کام یہ کیا ہے کہ ابتدائی باتوں کے بعد اکابر صُوفیا کو لیا ہے، مثلاً امام قشیری، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عبدالحق محدّث دہلوی۔ ان کے خیالات کا تحریری ریکارڈ ان کے خطوط سے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ دکھایا کہ کس طرح اصل ائمہ تصوّف پابندِ شریعت اور طالبانِ اقامتِ دین تھے۔

پھر غیر اسلامی تصوّف کا باب ہے۔ جس میں دکھایا گیا کہ کس طرح سادہ و صافی تصوّف میں آمیزشیں شروع ہو گئیں۔ اس سلسلے میں تصوّف کی ۶ قدیم عربی کتب پر کلام کیا گیا ہے۔ پھر مختلف مباحث جو لوگوں میں پیدا ہوئے وہ مذکور ہیں۔ مثلاً ذات و صفات کے فلسفیانہ مباحث، مومن و کافر کے درمیان امتیاز غلط ہے۔ (عروج صاحب نے قرآن کی آیات پیش کی ہیں) ایک بحث علمِ سینہ و سفینہ کی ہے۔ اہلِ تصوّف کا واقعہ، موسیٰؑ و خضرؑ سے استنباط وغیرہ۔

پھر عروج رحمتہ اللہ نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ تصوّف کی خاص خاص.اہم کتابوں (تعداد ۱۷) پر تبصرہ کرتے ہوئے کھوٹا کھرا بالکل نتھار دیا ہے۔ صرف اس حصے کے مطالعے سے ایک درست فکر مخلص آدمی اہلِ تصوّف کی ہر کجی کو جان سکتا ہے۔

اس موضوع پر دو ایک کتابیں پچھلے دنوں دیکھیں مگر یہ کتاب زیادہ محنت اور ژرف نگاہی سے عام فہم طرز پر لکھی گئی ہے۔

---o---

مقبوضہ کشمیر کے ٹارچر سیل:۔ مرتبہ محمد صغیر قمر۔ ناشر البدر پبلی کیشنز۔ ۲۳ راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۲۱ روپے۔

اس کتاب کے شروع میں میری ہی ایک نظم درج ہے جس کا ایک شعر اس کتاب کے موضوع کو خوب نمایاں کرتا ہے۔

؎اس جَور کو سب نے دیکھ لیا جو تم نے سرِبازار کیا
اس ظلم کو دنیا کیا جانے جو تم نے پسِ دیوار کیا

مقبوضہ کشمیر کی انسانی آبادی اس وقت 'عفریتوں' بہائم اور روبوٹوں کے گھیرے میں ہے' وہ بے رحمی سے قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہیں' مکانوں' دکانوں اور انسانوں کو سپردِ آتش کرتے ہیں' خواتین کے نوامیس پر اجتماعی حملے کرتے ہیں' بے گناہوں کو یونہی گولی مار دیتے ہیں۔

اس کتاب میں ان نوجوانوں کے اپنے بیانات درج ہیں جو بھارتی عقوبت خانوں کے جہنمی حالات کو خود بھگت کر آئے ہیں اور جنھوں نے بہت سے دوسرے حرّیت پسندوں کو شکنجوں میں کسے دیکھا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں بالعموم شروع سے آخر تک بہت سے جزئیات تک کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے بھارت کا متعصب اور مسلم دشمن ہندو کیسے درندہ مزاج سیکولرازم کا علمبردار بنا ہے' اور ہندو ذہنیت کی ناگن اپنے دانتوں میں انسانیت کش نفرت کا کیسا خوفناک زہر لئے ہوئے ہے۔

کاش کہ ان آپ بیتیوں کو فلم بند کر کے ایک بڑے پیانے کی عالمی عدالتِ ضمیر کے سامنے شہادت کے طور پر لایا جا سکتا اور اسی طرح دوسری تمام دستاویزات اور بیانات اور کارروائیوں کو بھی۔ مگر ابھی مسلمانوں کو جاگنے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو کام کرنے میں شاید وقت لگے گا۔ ابھی بھارت اور اسرائیل کے آدم خوروں کو ہمارا مزید خون پینا ہے۔ کتاب میں ٹارچر سیلوں کی فہرست دی گئی ہے۔ اور ان کا کچھ تعارف کرا دیا گیا ہے۔
